اسلامی خلفاء وملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق

# چند غلط فہمیوں کا ازالہ

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

اعداد وتعارف
محمد فہد حارث

حارث پبلیکیشنز

اسلامی خلفاء وملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق

# چند غلط فہمیوں کا ازالہ
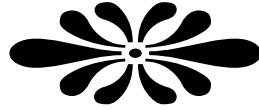

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

اعداد وتعارف | محمد فہد حارث



حارث پبلیکیشنز

Email: haris.fahad@gmail.com

# فہرست عنوانات

کمپوزنگ وڈیزائننگ
شہباز عالم انصاری
پتہ : مرزاہادی پورہ مئوناتھ بھنجن مئو پن کوڈ: ۲۷۵۱۰۱
اترپردیش انڈیا
موبائل:+917084725068
shahbazalam0095@gmail.com

# تعارف

زیر نظر کتاب مشہور اہلحدیث عالم فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کا ایک مختصر مقالہ ہے جو کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں ہمدرد فاؤنڈیشن کے تحت منعقدہ تیسرے مذاکرۂ ملی میں پڑھا گیا تھا جس کو بعد میں دار الدعوۃ السّلفیہ لاہور نے ایک مختصر رسالے کی شکل میں شائع کیا۔ سب سے پہلے تو یہ عرض کر دیں کہ اس رسالے کی پہلی خوبی اس کا اختصار اور جامعیت ہے۔ جن مباحث اور افکار کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہو سکتی تھی، حافظ صلاح الدین یوسف جیسے صاحب علم نے انتہائی جامعیت کے ساتھ ان کو ۷۰ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مقالے میں سمو دیا۔ یہ رسالہ اپنی پہلی سطر سے لیکر آخری سطر تک نہ صرف نہایت دلچسپ ہے بلکہ اسلامی نظام حکومت اور اسلامی خلفاء وملوک سے متعلق بہت ہی وقیع معلومات بھی بہم پہنچاتا ہے۔ حافظ صاحب اس مقالے کا آغاز ''اسلامی ریاست کی تشکیل کا صحیح طریقہ'' کی سرخی قائم کر کے کرتے ہیں جس میں وہ حکومتی سطح پر ایک ایسے ادارے کی تشکیل کا مطالبہ کرتے ہیں جس میں ایک طرف اعلیٰ درجے کے ایسے اہل علم شامل ہوں جنہیں قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کا گہرا ادراک حاصل ہو تو دوسری طرف اس طور کے جدید تعلیم یافتہ افراد شامل ہوں جو جدید مسائل کا بھرپور اِدراک رکھتے ہوں اور قلب وذہن کے لحاظ سے خالص مسلمان اور ہر طرح کے مغربی افکار کی مرعوبیت سے عاری ہوں، تا کہ ان ہر دو گروہ اہل علم افراد

پر مشتمل یہ ادارہ اسلامی ریاست سے متعلق درست منہج کی طرف عوام کی رہنمائی کر سکے اور ان کو پیش آمدہ جدید مسائل کا قرآن و حدیث کی روشنی میں حل پیش کر سکے۔ اس تمہید کے ساتھ حافظ صاحب ''موجودہ مسلمان مملکتوں کے حکمرانوں کا طرزِ عمل'' کے عنوان کے تحت ان کی اسلام بیزاری اور اسلام کو نقصان پہنچانے والے اقدامات پر سخت شکوہ کناں نظر آتے ہیں۔ اس سرخی کے تحت حافظ صاحب نے جو مقدمہ پیش کیا ہے وہ پڑھنے لائق ہے۔

آگے جا کر حافظ صاحب ''بعض مفکرین کی خامیاں اور کوتاہیاں'' کی سرخی قائم کر کے اسلامی ریاست کے قیام اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنے والے مفکرین کی مساعی کی تہہ دل سے تحسین کرنے اور معترف ہونے کے ساتھ ساتھ پورے احترام کے ساتھ ان سے اختلاف کرتے ہیں کہ موجودہ دور کے جمہوری نظام سے مرعوب ہو کر ان مفکرین نے ملوکیت یا بادشاہت کو نہایت مذموم شے باور کروانے پر اپنی محنتیں صرف کر رکھی ہیں اور ایسا کرتے ہوئے یہ اصحاب خلفائے اربعہ اور امیر عمر بن عبدالعزیزؒ کے علاوہ تمام خلفاء و سلاطین سے سخت نالاں نظر آتے ہیں اور ان کا ذکر ناگوار انداز میں کرتے ہوئے ان کے دور حکومت کو جاہلی حکومتیں باور کرواتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ صاحب ''خلافت و ملوکیت'' کے عنوان سے ایک بھرپور بحث کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کا اصل سیاسی نظام مباح ہے۔ شریعت کو اس سے قطعی بحث نہیں کہ نظام سیاسی کی ہیئت ترکیبی کیا ہوگی، سربراہِ حکومت کیسے برسرِ اقتدار آئے گا اور مختلف النوع معاشروں کو اسلامی برادری کے ایک رشتے میں کیسے منسلک کیا جائے گا۔ اللہ نے مسلمانوں سے جس خلافت کا وعدہ کیا تھا، اس میں یہ نہیں بتایا

کہ اسکا دستور اساسی کیا ہوگا، وہاں الفاظ ہیں ’’**کما استخلف الذین من قبلھم**‘‘ ( جیسے ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی )۔ دنیا میں حکومت کی جتنی اور جیسی بھی صورتیں رائج چلی آرہی ہونگی ویسی ہی مسلمانوں کی حکومت بھی ہوگی ،فرق صرف اتنا ہوگا کہ اس حکومت کا مقصد دین برپا کرنا ہوگا اوراس کے قوانین ایسے لچکدار ہونگے کہ دنیا کی ہرقوم انکے تحت زندگی بسر کرسکے۔اگر ملوکیت یا بادشاہت واقعی کوئی مذموم شے ہوتی تو یہ بات کیسی عجیب ہے کہ پوری تیرہ صدیوں میں اسلامی بادشاہتیں قائم رہیں لیکن عہد خیرالقرون سمیت کسی دور میں بھی علمائے امت نے اس نظام حکومت کونشانہ تنقید یاہدف ملامت نہیں بنایا۔ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں علمائے حق گزرے ہیں، ان کی موجودگی میں بادشاہی نظام قائم رہا،صحابہ کرام کے دور میں ایسا ہوا، تابعین وتبع تابعین کے دور میں فقہاء ومحدثین کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے جنھوں نے مختلف مواقع پر مختلف کاموں پر خلفائے اسلام کوٹوکا لیکن ان میں سے کسی نے خلیفہ کواپنے بعد اپنے بیٹے کونامزد کرنے پرنہیں ٹوکا،کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ نظام حکومت صحیح نہیں ہے۔تو پھر ہمارے موجودہ زمانے کے مفکرین کی یہ خامہ فرسائی کہ ملوکیت و بادشاہت سرتاپا مذموم ہے جس کے بانی ایک جلیل القدر صحابی سیدنا معاویہ ؓ تھے جن کے عہد حکومت کے اختتام تک اسلامی حکومت کی تمام امتیازی خصوصیات مٹ چکی تھیں،سخت گمراہ کن نظریہ ہے،جس کی تبلیغ واشاعت سے اسلاف سے بدظنی کے علاوہ اورکوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ملوکیت کے مباح ہونے کی تائید میں حافظ صاحب مختلف علماء ومورخین کے تائیدی اقوال بھی ساتھ ساتھ نقل کرتے جاتے ہیں۔

تاہم قاری کوکسی قسم کا التباس نہ ہو کہ شاید حافظ صاحب خلافت راشدہ اور مابعد کی حکومتوں کو بالکل یکساں قرار دینے کی کوشش کررہے ہیں، اس لیے حافظ موصوف صراحت سے بحث کرتے ہیں کہ بلاشبہ خلافت راشدہ میں خلفائے راشدین کا اسلامی کردار جتنا شفاف اور بے غبار تھا، بعد کے خلفاء وملوک کا کردار بالعموم اس معیار سے فروتر ہی رہالیکن یہ کہنا بھی سخت غیر درست ہے کہ خلافت راشدہ کے جاتے ہی جوحکومتیں آئیں وہ جاہلیت کی آئینہ داراور اسلامی خصوصیات سے عاری تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انحطاط کا یہ عمل دورنبوت سے بُعد کے ساتھ بتدریج ہوااور جیسے جیسے بُعد بڑھتا گیااور زمانہ گزرتا گیا یہ انحطاط بھی بڑھتا گیالیکن یہ زوال و تنزل صرف نظام سیاست میں ہی نہیں آیا بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آیا جس میں اخلاق و معاشرت کوبھی اتنا ہی دخل رہا جتنا سیاست کو۔

آگے جاکر ''مطلوب ونامطلوب'' کی بحث قائم کرکے حافظ صاحب صراحت سے ثابت کرتے ہیں کہ کوئی بھی نظام حکومت مطلوب یا نامطلوب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا استعمال اسکو مطلوب یا نامطلوب ٹھہراتا ہے۔ اگر ملوکیت کے زیراثر آنے والا حکمران عمر بن عبدالعزیزؒ جیسا متقی انسان ہوتو یہی ملوکیت مطلوب ٹھہرتی ہے جبکہ اگر خلافت کے شوروی نظام کے تحت آنے والاشخص موجودہ حکمرانوں جیسا کرپٹ نکل جائے تو وہی خلافت مذموم ہوجائیگی۔ نظام حکومت کا مطلوب ونامطلوب ہونا، حکمران مقرر کرنے کے طریقے میں مضمر نہیں، بلکہ اس نظام حکومت کے نتائج میں مضمر ہے۔ صفحہ ۴۸ پر ''دور حاضر کے مفکرین کا نقطۂ نظراور اس کے خطرناک نتائج'' کی سرخی قائم کرکے حافظ صاحب ثابت کرتے ہیں کہ ان اصحاب کا قائم کردہ مقدمہ اس

بات پر منتج ہوتا ہے کہ اسلامی نظام حکومت ایک طرح کا ناقابل تنفیذ نظام حکومت ہے جو کہ صرف تیس سال میں ہی غیر پائیدار ثابت ہوگیا اور جو نبی یہ نظام حکومت لا یا تھا اس کے اپنے تربیت یافتہ اصحاب نہ صرف اس کو چلانے میں سخت ناکام رہے بلکہ ان کے ہاتھوں ہی یہ نظام حکومت اپنی موت مرکر ملوکیت جیسے ''مذموم'' نظام میں تبدیل ہوگیا۔ اسی منطقی سوچ کا نتیجہ ہے کہ یہ مفکرین پوری بیبا کی و دلیری کے ساتھ سیدنا عثمانؓ، سیدہ عائشہؓ، سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ، سیدنا عمرو بن العاصؓ اور سیدنا معاویہؓ وغیرہم کے کردار کو مجروح تاریخی روایات کے زیرِ استدلال بری طرح مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ جبکہ مستشرقین یہ باور کروانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اسلامی نظام قائم نہیں کرسکے تو آج کے یہ داعی بھلا کیا کرسکیں گے۔

آگے جا کر صفحہ ۱۵ پر ''بگاڑ کے اسباب'' کے عنوان کے تحت انتہائی عالمانہ اور منطقی بحث قائم کر کے حافظ صاحب صراحت سے ثابت کرتے ہیں کہ اس بگاڑ کی اصلی وجہ عربی کے اس مقولے میں پنہاں ہے کہ **أعمالکم عمالکم** یعنی جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسے حکمران تم پر مسلط ہونگے۔ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوری کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے میں بحیثیت مجموعی تنزل و انحطاط واقع ہوتا رہا جس کا دائرۂ کار اخلاقیات و معاشرت سے لیکر معاشیات و سیاسیات تک محیط تھا۔ جبکہ ہمارے موجودہ مفکرین کی بنیادی غلطی یہ رہی کہ ان کے نقطۂ نظر سے بگاڑ صرف سیاست میں آیا جبکہ بگاڑ ہر شعبۂ زندگی میں اپنی تدریجی رفتار سے آیا جس کے اثرات سیاست پر بھی پڑے۔

صفحہ ۶۳ پر حافظ صلاح الدین یوسف صاحب اس کتاب کی سب سے دلچسپ بحث بعنوان ''موجودہ حالات میں کیا جمہوریت ہمارے لیے موزوں اور مناسب ہے؟'' قائم کرتے ہیں۔ اس عنوان کی بابت یہاں کچھ عرض کرنا قبل از وقت مطالعہ کے لطف کو کم کرنے کے مترادف ہی ہوگا۔ قارئین خود یہ بحث پڑھیں اور سر دھنیں کہ کیا ہی عمدہ مبحث قائم کر کے حافظ صلاح الدین یوسف اسلامی نظام حکومت کے لیے ایک بہترین لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں۔ آخر میں ''موجودہ ملکی حالات سے متعلق چند باتیں'' کے تحت اپنی گزارشات قارئین کے سامنے رکھ کر حافظ صاحب اس نصیحت کے ساتھ مقالے کا اختتام کرتے ہیں کہ اصل ضرورت بحیثیت قوم اپنا رخ بدلنے کی ہے۔ حکمرانوں کو کوسنا، اور ہر غلط چیز کے لیے بیوروکریسی وغیرہ کو موردالزام ٹھہرانا کوئی حل نہیں ہے۔ یہ حکمران یہ بیوروکریٹ کوئی آسمان سے نہیں ٹپکے۔ یہ ہم آپ میں سے ہی اوپر اٹھ کر آتے ہیں۔ جب قوموں کا مجموعی مزاج ہی زوال کا شکار ہو تو پھر ان پر عمال وحکمران بھی بداعمال ہی مقرر ہوتے ہیں۔ سو اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ بحیثیت فرد، بحیثیت قوم ہم اسلامی قوانین اور اخلاقی ضابطوں کی پابندی کریں اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بغاوت کا وہ راستہ چھوڑ دیں جس پر اس وقت ہماری پوری قوم گامزن ہے۔

محمد فہد حارث

# ذہنی مرعوبیت کی انتہاء

ایک نکتہ داں شخص نے کس قدر سچ کہا کہ:

’’ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کرلیا ہے بلکہ یہ رونا بھی ہے کہ ہمارے مردوں پر بھی یورپ کے مردوں نے فتح پالی ہے۔

ہر موقع اور ہر محل پر جب شجاعت، ہمت، غیرت، علم وفن غرض کسی کمال کا ذکر آتا ہے تو اسلامی ناموروں کے بجائے یورپ کے ناموروں کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ قوم سے قومی حمیت کا مادہ بالکل جاتا رہا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم میں ابتداء سے اخیر تک اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اسلاف کے کارناموں سے واقفیت حاصل کی جائے، اس لیے جب خصائل انسانی کا ذکر آتا ہے تو خوامخواہ انہی لوگوں کا نام زبان پر آتا ہے جن کے واقعات کی آوازیں کانوں میں گونج رہی ہیں اور وہی یورپ کے نامور ہیں۔‘‘

علامہ شبلی نعمانی مرحوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

**نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریمؐ**

''اسلامی ریاست کا تصور'' یہ موضوع آج کل عام ہے جس پر اپنے اور بیگانے داد تحقیق دے رہے ہیں۔ ہمدرد فاؤنڈیشن نے بھی اپنے اس تیسرے مذاکرۂ ملی میں اس موضوع کو منتخب کیا ہے۔ اور اہل علم وفکر کو دعوت دی کہ وہ اپنے نتائجِ فکر اس مذاکرے میں پیش کریں۔

عام خیال یہ ہے کہ تصورِ ریاست اسلامی خاصا مبہم اور غیر واضح ہے جس کی توضیح وتفسیر عصرِ حاضر کی شدید ضرورت ہے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن نے بھی اس نقطۂ نظر کے ساتھ اہل علم کو دعوت فکر دی ہے۔

راقم کو اس نقطۂ نظر سے قدرے اختلاف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید زندگی نے جو وسعت اختیار کر لی ہے اور اسکی وجہ سے جو پھیلاؤ نظمِ حکومت اور کاروبار مملکت میں آ گیا ہے، اس کا تصور بھی چند صدیوں قبل نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے نئے نئے اداروں کی تشکیل، ان کی بوقلموں نوعیتوں اور گوناگوں ذمہ داریوں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت از بس ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ اسلام ایک ابدی مذہب ہے جسے قیامت تک باقی رہنا ہے۔ اس لیے اس میں ایسے واضح اصول موجود ہیں جو ہر دور کے نت نئے تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کی روشنی میں جدید دور کے مسائل اور ان کی پیچیدگیوں کا حل نکالا جا سکتا ہے۔

## اسلامی ریاست کی تشکیل کا صحیح طریقہ:

اس لیے اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حکومتی سطح پر ایک ایسا ادارہ معرضِ وجود میں آئے جس میں ایک طرف اونچے درجے کے وہ اہل علم شریک ہوں جنہیں قرآن وحدیث کا پورا علم ہو اور فقہ اسلامی میں وہ گہری نظر رکھتے ہوں۔ اور دوسری طرف ایسے جدید تعلیم یافتہ افراد اس میں شامل ہوں جو جدید مسائل کا ادراک اور ان کی پوری تفصیلات کا صحیح علم رکھتے ہوں۔ قلب و ذہن کے لحاظ سے خالص مسلمان ہوں اور مغربی افکار و تصورات سے ان کے دماغ مرعوب اور تہذیب مغرب کی چکا چوند سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اقبال کی زبان میں علماء ابلہ مسجد یا ملائے مکتب نہ ہوں۔ اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات ''تہذیب کے فرزند'' نہ ہوں۔ ادارے کے لیے وسیع لائبریری کا انتظام کیا جائے جس میں جدید وقدیم تمام ضروری لٹریچر موجود ہو۔

یہ ادارہ ہر اہم مسئلے پر غور کرے اور قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں اس کا حل پیش کرے۔ یہی ادارہ جدید اداروں کی تشکیل اور ان کی ذمہ داریوں کی تعیین کرے اور یہی ادارہ اسلامی ریاست کے تصور کو اجاگر کرے کہ اسے کن خطوط پر اُستوار کیا جائے، پارلیمانی نظام حکومت زیادہ موزوں ہے یا صدارتی طرز حکومت؟ انتخاب کا طریق کار کیا ہو؟ بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخاب ہو یا مخصوص اہلیت کے حامل افراد ہی کو ووٹ کا حق حاصل ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ اسلام نے حکومت کے مقاصد اور حکمرانی کے اصول تو واضح طور پر بتلا دیے ہیں۔ لیکن حکومت کا کوئی ایک طریق کار متعین نہیں کیا ہے، اس میں گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ ہر

دور کے مسلمان اپنے احوال وظروف کے مطابق طرزِ حکومت اختیار کرسکیں حتیٰ کہ اسلام میں شخصی حکومت اور بادشاہی نظام کی ممانعت کی بھی کوئی صریح دلیل موجود نہیں ہے (جیسا کہ آج کل عام لوگ اسے اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں)۔

## موجودہ مسلمان مملکتوں کے حکمرانوں کا طرزِ عمل:

لیکن بدقسمتی سے یہ صحیح طریق کار کسی بھی اسلامی ملک میں اختیار نہیں کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ بجز سعودی عرب کے کوئی بھی اسلامی ملک اسلام کے نفاذ کے معاملے میں مخلص نہیں ہے۔ اسلامی ملکوں پر جو قیادت مسلّط ہے چاہے وہ فوجی ہے، یا جمہوری، عملاً دونوں سیکولر اور فاشسٹ ذہن کی حامل ہیں۔ سیکولر اس لیے کہ ہر حکمران اور اس کی انتظامیہ اپنے ملک اور معاشرے میں اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب کو فروغ دے رہی ہے اور مغربی فکر کے مطابق ہی تمام پالیسیاں تشکیل پاتی ہیں حتیٰ کہ تعلیمی پالیسی میں بھی مغربی ذہن ہی کارفرما ہے۔ اس لیے ہماری نوجوان نسل کی اکثریت اسلامی شعور سے بے بہرہ اور اسلامی تہذیب سے بیگانہ و برگشتہ ہے۔ اور مخلوط تعلیم کی لعنت ہر اسلامی ملک میں موجود ہے اور یہ حکومتیں فاشسٹ اس لیے ہیں کہ طرز عمل ان سب کا آمرانہ اور ڈکٹیٹرانہ ہے۔ مسلمان عوام اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں لیکن ہمارے اسلامی ملکوں کے ''مسلمان'' حکمران بہ جبر مسلم عوام کو اسلام سے دور لے جارہے ہیں، عوام کی مرضی اور رائے کے بالکل برعکس اپنی مرضی اور رائے ان پر مسلّط کررہے ہیں۔ نتیجتاً ہمارے اسلامی ملک بڑی برق رفتاری کے ساتھ اسلامی تہذیب سے بیگانہ ہورہے ہیں اور مغربی تہذیب کو اپنانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں۔ آہ۔۔! فَلْيَبْكِ على الإسلام من

کان باکیاً۔۔ اسلام بے چارہ بہ زبان حال کہہ رہا ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

کہ بامن ہرچہ کرداں آشنا کرد

البتہ مسلم عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے چند ادارے ضرور اس قسم کے بنا رکھے ہیں جن کے نام اسلامی ہیں اور جن کو اسلامی تحقیق کے ادارے باور کرایا جاتا ہے جیسے ہمارے ملک میں ''اسلامی تحقیقاتی ادارہ'' ہے۔ ایک اسلامی نظریہ کونسل ہے، شرعی عدالتیں ہیں، وزارتِ اُمورِ مذہبی ہے اور وزارتِ حج و اوقاف ہے۔ ان پر بلامبالغہ لاکھوں نہیں کرڑوں روپے سالانہ خرچ ہوتا ہے لیکن فائدہ ان کا ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے کا آئینہ دار ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ان اداروں میں کام کرنے والے علماء علمی و تحقیقی صلاحیتوں کے حامل نہیں ہیں۔ بعض ادارے بلاشبہ خالص علمی و تحقیقی کام کے لیے وقف ہیں، ان سے وابستہ اہل علم وفکر بھی ملک کی ممتاز اور نہایت برگزیدہ شخصیتیں ہیں۔ میری گفتگو کا اصل مقصد اور مدّعا یہ ہے کہ حکومت ان اداروں کے قیام میں مخلص نہیں ہے، اس لیے ان اداروں کے ذریعے سے اگرچہ اسلامی موضوعات پر مختلف تحقیقی کام سرانجام پا رہے ہیں لیکن اسلامی نظام کے قیام کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے جیسا کہ ان اداروں کے قیام کا مقصد یہی کچھ بتلایا جاتا ہے۔ اس لیے وہ خلا بدستور موجود ہے جس کا ذکر راقم کر رہا ہے۔ ہر حکومت کا مقصد محض وقت گزاری اور اپنے اقتدار کی مدّت کو طویل سے طویل تر کرنے کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ ؎

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

کے مطابق ہر آنے والا حکمران پچھلی کوششوں پر خطِ تنسیخ پھیر کر نئے سرے سے اپنی کوششوں کا آغاز کرتا ہے، نئے اداروں کا قیام عمل میں لاتا ہے۔ یا پرانے اداروں میں نئی روح پھونکنے کا عزم ظاہر کرتا ہے، نئے نئے کمیشن بٹھاتا ہے۔ اور بلند بانگ دعاوی سے ملک وقوم کا نقشہ بدل ڈالنے کی نوید سُناتا ہے لیکن کچھ عرصہ گزرنے پر، تمام تر دعاوی کے باوجود اور بہت کچھ اتھل پتھل کرنے کے باوصف، معلوم ہوتا ہے ۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

حضرات محترم! میری اس تلخ نوائی پر شاید کچھ جبینیں شکن آلود ہوجائیں، کچھ چہرے خشمگیں ہوں اور بعض دلوں کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچے لیکن ۳۶ سال سے شب وروز جو تماشہ ہمارے سامنے ہو رہا ہے اس کے پیش نظر میں اس تلخ نوائی پر مجبور ہوں کہ ۔

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز ترمی خواں چوں محمل راگراں بینی

اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ اس تلخ نوائی پر کبیدہ خاطر نہ ہوں گے بلکہ اس تلخی کے پیچھے ملک وملت کی اصلاح کا جو جذبہ اور درد کارفرما ہے، اس پر نظر رکھیں گے بقول علامہ اقبالؒ

چمن میں تلخ نوائی مِری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

بہر حال عرض یہ کیا جارہا تھا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جو صحیح طریق کار تھا، اسے مسلمان مملکتوں کی قیادت اپنانے کے لیے تیار نہیں، البتہ بطور ''شوپیس'' انہوں نے چند

ادارے اسلام کے نام پر ضرور قائم کر رکھے ہیں لیکن ان اداروں کی ساری کوششیں اور کاوشیں ایک مشورے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ سارے اختیارات ہیئتِ حاکمہ اور اس کے چند چہیتے بیوروکریٹوں کے پاس ہیں، وہ اسلامی اداروں کی رائے کو بالکل نظر انداز کر دیں یا ان کا حلیہ بگاڑ کر انہیں نافذ کریں، انہیں اختیار ہے اور عملاً یہی ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی نظریاتی کونسل ایک مسودۂ قانون اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب کر کے حکومت کو بھیجتی ہے تو وزارت قانون کے بزرجمہر یا مشیران خصوصی نام کی مخلوق یا دیگر متعلقہ افسران مجاز اس اسلامی قانون کے مسودے کو سرد خانے کی نظر کر دیں یا اس میں حک و اضافہ کر کے اس کی اسلامی صورت ہی بدل ڈالیں الغرض اس کے ساتھ جو حشر چاہیں کریں، وہ کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں اور اسلامی نظریاتی کونسل کی بہت سی اہم اسلامی سفارشات اور مسودہ ہائے قانون کا یہی حشر ہوا ہے۔ آہ ؎

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

حکمرانوں کی اس مخصوص پالیسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے بارے میں یہ تاثر پھیل رہا ہے کہ اسلام اس دور میں شاید قابل عمل ہی نہیں ہے۔ اور وہ اس دور کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی نظام کی ترتیب و تدوین کے عنوان پر لمبے چوڑے اداروں کے قیام کے باوجود جب ۳۶ سال کے طویل عرصے میں ایک بھی اسلامی قانون کا نفاذ صحیح معنوں میں عمل میں نہ آ سکے تو مذکورہ تاثر کا پھیلنا حیرت و استعجاب کا باعث نہیں ہو سکتا۔

## آمدم برسرِ مطلب:

یہ تو تھا ہمارے حکمرانوں کا طرزِ عمل اور اس کے نتائج، جو غیر ارادی طور پر زبان قلم پر آ گئے اور یہ ذکر

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

کے تحت کچھ طول بھی پکڑ گیا کہ اپنے افسانۂ درد میں بھی ایک گونہ لذت ہوتی ہے۔

قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

## بعض مفکرین کی خامیاں اور کوتاہیاں:

ورنہ راقم نے اس مذاکرے کے لیے ایک اور موضوع کا انتخاب کیا تھا اور وہ ہے موضوع مذاکرہ سے متعلق اسلامی مفکرین کی بعض خامیاں اور کوتاہیاں اور اسلامی خلفاء وملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ۔

اسلامی ریاست کے موضوع پر عربی اور اردو دونوں زبانوں میں خاصا کام ہوا ہے اور متعدد کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ جن سے اس موضوع کے اہم گوشے بے نقاب ہوئے ہیں۔ جن اہل علم وفکر نے اس موضوع کو اپنایا اور اپنے نتائج فکر پیش کیے ہیں ان کی کوششیں بلاشبہ قابل صد تحسین ہیں اور ان کی گراں قدر تالیفات علم وتحقیق کا بیش قیمت سرمایہ ہیں تاہم ان مفکرین کی ان تحقیقی کاوشوں میں بعض خامیاں اور کوتاہیاں بالعموم پائی جاتی ہیں۔ اِلَّامَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ تعالیٰ

راقم کے خیال میں ان کی وضاحت اس لیے ضروری ہے تاکہ آئندہ ان کا اعادہ نہ

کیاجائے اور ان سے دامن بچا کر موضوع زیر بحث کومزید منقح ومہذب کیا جائے۔ یہ فکری خامیاں حسب ذیل ہیں۔

**۱۔** موجودہ دور کے مفکرین کی اکثریت کے نزدیک ملوکیت اور بادشاہت بجائے خود مذموم ہے اور اسلام میں کسی صورت اس کی گنجائش نہیں۔

**۲۔** اسی لیے خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ماسوا تمام خلفاء وسلاطین اسلام سے یہ حضراتِ اہلِ علم خوش نہیں اور ان کا تذکرہ سخت ناگوار انداز میں کرتے ہیں اور ان کے ادوارِ حکومت کا سررشتہ خلافت اسلامیہ سے کاٹ کر انہیں خالص دنیوی اور جاہلی حکومتیں یاد کراتے ہیں۔

**۳۔** اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام میں بگاڑ کا واحد سبب ملوکیّت کو قرار دیتے ہیں۔ گویا ملوکیت ان کے نزدیک منبعِ فساد ہے۔

**۴۔** اور مغربی جمہوریت کو ایک آئیڈیل نظامِ حکومت تصور کرتے ہیں اور اسے ہی واحد اسلامی نظام حکومت باور کراتے ہیں۔

یہ چار چیزیں قدر مشترک کے طور پر ان کی اکثریت میں پائی جاتی ہیں جو راقم کے خیال میں ایک طرح کی فکری خامیاں ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے ان کی ضروری تفصیل حسب ذیل ہے۔

# خلافت وملوکیّت

اسلام کا نظام حکومت کیا ہے؟ اس کے خدّ وخال اور اس کی صورت ونوعیت کیا ہے؟ یہ آج کل ایک عام سوال ہے جس کے ضمن میں خلافت اور اس کی خصوصیات بھی زیر بحث آتی ہیں، بادشاہت اور اس کی مبیّنہ خرابیوں کا تذکرہ بھی ہوتا ہے اور اس کی خوبیوں کا بیان بھی ہوتا ہے۔

ان میں اسلام کا اصل سیاسی نظام کون سا ہے؟ اس کا صاف جواب تو یہی ہے کہ خلفائے راشدین نے جن خطوط پر سیاسی نظام کو استوار کیا اور ان کے طرز حکمرانی نے جو بےلوث اور بےداغ کردار پیش کیا، وہ ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسلام کے نظام سیاست اور اس کے طرز حکمرانی کا۔ مثلاً

* خلفائے راشدین بیشتر حالات میں ایسے اہم معاملات میں جہاں نص شرعی نہ ہوتی، قوم کے اہل الرائے سے مشورہ لیتے جس سے خلافت کی یہ خصوصیت معلوم ہوئی کہ وہ ایک شُوروی حکومت تھی۔

* بیت المال کو وہ ایک امانت سمجھتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ناجائز طور پر قومی خزانے سے نہ کچھ خرچ کرتے تھے نہ اس کے لیے وصول کرتے تھے۔ اپنے ذاتی یا سیاسی اغراض کے لیے بیت المال سے خرچ کرنے کا کوئی تصور ان کے اندر نہیں تھا جس سے خلافت کی یہ خصوصیت معلوم ہوئی کہ قومی خزانہ خلقِ خدا کی ایک امانت ہے جس میں حکمران کو بھی اپنے من مانے

طریقے سے خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

* انہوں نے حکمران ہونے کے باوجود اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھا۔ حالانکہ ان کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر خلیفہ کی طرف سے کسی پر زیادتی ہوئی ہے تو وہ اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر سکے اس سے کوئی خلافِ قانون حرکت سرزد ہوئی ہے تو اس سے باز پرس کر سکے، جس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نظام خلافت میں حکمران اعلیٰ بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے، اسلامی احکام کی پابندی اور ملکی قوانین کا احترام اس کے لیے بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ایک عام مسلمان اور ملک کے عام باشندے کے لیے ضروری ہے۔

* خلفاء نے اپنے کو تنقید سے بھی بالاتر نہیں سمجھا اور اظہار رائے پر قدغن نہیں لگائی۔ وہ پانچوں وقت خود عام لوگوں کی امامت کراتے اور جمعہ وعیدین کے موقع پر لوگوں سے براہ راست خطاب فرماتے۔ یُوں ہر شخص کے لیے ان پر تنقید کرنا اور ان کو روکنا ٹوکنا ممکن اور آسان تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ حکمرانوں کا عوام کی دسترس سے بالا رہنا یا انہیں اظہارِرائے سے محروم رکھنا یہ اسلام کے نظامِ خلافت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

* خلفاء نے اپنے کو قبیلہ وخاندان اور نسل ووطن کی عصبیتوں سے بھی پاک رکھا جس کی اسلام نے بڑی تاکید کی ہے حتیٰ کہ احتیاطاً اپنے اہل وعیال کو وہ مراعات تک بھی نہ دیں جو عام لوگوں کو انہوں نے مہیا کیں تاکہ ان پر کسی بھی قسم کی جنبہ داری یا خویش نوازی کا الزام عائد نہ ہو سکے، جس سے معلوم ہوا کہ اسلامی خلافت، قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں اور دیگر اس قسم کی آلائشوں سے پاک ہوتی ہے۔

* خلفائے راشدین نے اپنا معیارِ زندگی بالکل سادہ رکھا۔ خوراک کا خرچ عام لوگوں سے بھی کم، لباس بالکل سستا اور وہ بھی پیوند لگا نہ صدارتی محل نہ زرنگار ایوانِ حکومت، نہ باڈی گارڈ کا طنطنہ، نہ شاہانہ کروفر کا ہمہمہ اور نہ خدم وحشم کا لاؤ لشکر جس سے خلافت کی یہ خصوصیت معلوم ہوئی کہ وہ انتہائی سادہ نظام ہے۔ جس میں تعلقات وآرائش کی کم سے کم گنجائش ہے۔

یہ تو تھیں خلافت کی وہ خصوصیات جو خلفائے راشدین کے عمل سے مستفاد ہیں جن کی بنیاد دراصل وہ اصول ومقاصد ہیں جو اسلام نے حکمرانی اور اسلامی ریاست کے لیے متعین کیے ہیں۔ مثلاً حاکمیّت خداوندی، عدل بین الناس، مساوات بین المسلمین، اطاعت فی المعروف والنہی عن المنکر اور نظام صلوٰۃ وزکوٰۃ کا قیام وغیرہ۔

اس کے مقابلے میں ''ملوکیّت'' کا لفظ ہے جس کو خلافت کے متضاد سمجھ لیا گیا ہے۔ بلا شبہ اسلام سے پہلے جو بادشاہتیں قائم تھیں یا اس کے بعد بھی جو غیر مسلم قوموں میں قائم رہیں، وہ خلافت اسلامیہ کی خصوصیت کے برعکس تھیں۔ ان میں بادشاہ مطلق العنان حکمران ہوتا تھا اور قانون سے بالاتر حاکمیّت خداوندی کا کوئی تصور ان کے اندر موجود نہیں تھا۔ بیت المال کے امانت ہونے کا تصور نہیں تھا۔ بلکہ رعیت بادشاہ کی باجگزار سمجھی جاتی تھی۔ بادشاہوں کا رہن سہن اور طرز بودوباش سادگی کے بجائے انتہائی رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ اور شاہانہ طمطراق پر مبنی تھا۔ بادشاہ عوام پر جو ظلم وستم چاہتے کرتے، کوئی دادفریاد اور استغاثے کی صورت نہ ہوتی، وہ تنقید سے بالاتر سمجھے جاتے تھے، کوئی ان کو روکنے ٹوکنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

''ملوکیّت'' یا ''بادشاہت'' اس مفہوم میں یقینا خلافت کی ضد ہے۔ جس کی گنجائش

اسلام میں نہیں ہے۔لیکن اصل مسئلہ تاریخ اسلام یا اسلامی خلفاء وسلاطین کا اور ان اسلامی بادشاہتوں کا ہے جومختلف ادوار میں اسلامی قلمرَ و میں قائم رہیں۔آیا یہ بادشاہتیں بھی اسی انداز کی تھیں جس کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے؟ اور کیا یہ بادشاہتیں بھی اسلامی خلافت کی خصوصیات سے بالکل تہی دامن تھیں؟

ہمارے دور کے اکثر مفکرین تو اس کا کھٹ سے یہی جواب دیتے ہیں کہ ہاں یہ بادشاہتیں بھی ویسی ہی تھیں جو اسلام میں پسندیدہ نہیں۔نیز یہ کہ خلافت کی خصوصیات سے بھی یہ بادشاہتیں بالکل عاری تھیں بلکہ بعض مفکرین نے تو ان کو جاہلی حکومت تک سے تعبیر کیا ہے۔

میں بصد ادب گزارش کروں گا کہ اسلامی بادشاہوں کے بارے میں اور اسلامی تاریخ سے متعلق یہ نقطۂ نظر تصحیح اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔اسلامی بادشاہتوں کا آغاز ۳۰سالہ خلافت راشدہ کے بعد حضرت معاویہؓ کے دورِ حکومت سے کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ آخری عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی تک قائم رہتا ہے۔۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے الغائے خلافت کا اقدام کر کے اسلامی بادشاہتوں کا یہ سلسلہ ختم کیا۔گویا تیرہ صدیوں سے زیادہ اسلامی بادشاہتوں کا یہ سلسلہ پوری اسلامی قلمرو میں بلا کسی ادنیٰ اختلاف کے جاری رہا۔جس میں کم وبیش دوسو سال (خلافت راشدہ کے بعد) کا وہ عرصہ بھی شامل ہے جس کو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا دور کہا جاتا ہے۔یہ دور' کتاب ''تبع تابعین'' جلد اوّل کے فاضل مؤلف مولانا حافظ مجیب اللہ ندویؔ کے قول کے مطابق عباسی خلیفہ متوکل کے دورِ خلافت تک محیط ہے جس کا قتل ۲۴۷ھ کو ہوا۔گویا اسلامی بادشاہتوں کے ابتدائی دوسو برس صحابہ وتابعین اور تبع تابعین کے عہدِ زرّیں

میں گزرے اور اسلام کے ابتدائی صدیوں کا یہ دور زبان رسالت مآب ﷺ کی رُو سے خیرالقرون ہے۔خیر القرونِ قرنی ثمّ الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔الحدیث۔

یہ قرون ثلاثہ مشھود لہا بالخیر اسلام کا عہد زرّیں ہے جس میں صحابہ کرامؓ کا دور بالخصوص ہمارے لئے قندیلِ ہدایت اور مینارۂ نور ہے اوراس کے بعد تابعین و تبع تابعین کا عہد سعادت مہد بھی علم وعمل کی تابانیوں سے معموراور سیرت وکردار کی رفعتوں اور عظمتوں کا آئینہ دار ہے۔صحابہ وتابعین کے دور میں اموی حکمرانوں کوانکی غلط رویوں پر صحابہؓ وتابعین نے ٹوکا اور بلاخوف لومۃ لائم حق گوئی کا فریضہ ادا کیا تبع تابعین کے دور میں خلافت عباسیہ میں ائمہ دین اور علمائے امت نے دین حق کی پاسبانی کا حق پوری جرأت وہمت سے ادا کیا۔اسی دور میں فتنۂ اعتزال نے جنم لیا۔فتنہ خلق قرآن حشر بداماں بن کرسامنے آیا اور مسئلہ طلاق مکرہ نے علماء کے لیےدارو رسن کے اسباب مُہیا کیے ان فتنوں کے پشت پناہ خود عباسی خلفاء تھے، اختیارواقتداران کے پشتیبان تھے لیکن دنیا جانتی ہے کہ امام احمدؒ نے اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کرفتنہ خلق قرآن کا پوری جرأتِ ایمانی سے مقابلہ کیا،اختیارواقتدار کی قہرمانی کوقطعاً خاطر میں نہ لائے۔اورقیدوبند کی تمام صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ امام مالکؒ نے طلاق مکرہ کے مسئلے پر خلیفہ وقت سے ٹکرلی۔حتیٰ کہ ان کا منہ کالا کرکےاور گدھے پر سوار کراکے ان کی تذلیل واہانت کا ڈرامہ سر بازار رچایا گیا۔ اور ان کی مشکیں کس دی گئیں لیکن اس حالت میں بھی وہ اعلان حق اور مسئلے کی صحیح وضاحت سے باز نہ آئے اوراس طرح کی متعدد مثالیں اور واقعات ہیں جن میں علمائے حق نے خلفائے وقت کوٹوکا، ان پر سخت

تنقیدیں کیں اوران کے غلط رویوں کی اصلاح کی۔

اب یہ بات کیسی عجیب ہے کہ پوری تیرہ صدیاں اسلامی قلمرو میں بادشاہتیں قائم رہیں لیکن عہد خیر القرون سمیت کسی بھی دور میں علمائے امت نے اسے نشانۂ تنقید اور ہدف ملامت نہیں بنایا۔ دراں حالیکہ تنقید اورحق گوئی کا فریضہ انہوں نے خطرناک سے خطرناک حالات میں بھی ادا کیا ہے۔ کئی مسائل میں براہ راست خلفائے وقت سے تصادم مول لیا۔ ان سے لڑ گئے اور بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں لیکن حق سے انحراف اور حق گوئی سے دست برداری کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں علمائے حق گزرے ہیں۔ ان کی موجودگی میں یہ بادشاہی نظام قائم رہا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں ایسا ہوا۔ تابعین کے دور میں ہوا۔ تبع تابعین کے دور میں فقہاء ومحدّثین کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔ جنہوں نے جان پر کھیل کر اسلام کی حفاظت کی۔ سب کے سامنے خلفاء مرتے رہے اوران کی جگہ انہیں کے بیٹے یا قریبی رشتہ دار منصب خلافت پر فائز ہوتے رہے۔ یعنی بادشاہی نظام عہد بہ عہد قائم رہا لیکن کسی عالم، امام، محدّث فقیہ مدبر اور مفکر کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ وہ کہتا کہ یہ نظام صحیح نہیں ہے، اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

ہمارے پاس اس امر کے لیے کوئی معقول دلیل نہیں ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ اور تمام مسائل میں ہمیشہ علمائے حق نے لاگ لپیٹ کے بغیر دوٹوک طریقے سے حق گوئی کا فریضہ ادا کیا لیکن صرف اسی ایک مسئلے میں ان کی جرأتیں اور ہمّتیں جواب دے گئی تھیں اور ان کی زبانوں کو تالے لگ گئے تھے۔ ہم تو ان کے طرز عمل سے یہی سمجھیں گے کہ ان کی نظر میں فی نفسہ بادشاہی نظام اور طریقۂ ولی عہدی میں کوئی خرابی یا قباحت ایسی نہ تھی جس سے اسلام کا کوئی

تقاضا مجروح و پامال ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور اس کی بھی اس طرح وضاحت کرتے جس طرح وہ اس طریقے سے برسرِ اقتدار آنے والے خلفاء وملوک کے غلط رویوں کی وضاحت کرتے رہے۔ دنیا کا کوئی خوف یا لالچ ان کو اس سے نہ روک سکا۔ رحمۃ اللہ ورضوانہ علیہم اجمعین۔

# قیصریت وکسرویت

اس سلسلہ میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ یہ شاہی نظام قیصر وکسریٰ کا ورثہ ہے،اس لیے یہ قیصریت وکسرویت ہے جس سے اجتناب کی ضرورت ہے لیکن میں عرض کرونگا کہ ایسے افعال جو فی نفسہ جائز ومباح ہوں اوران کا رواج غیر مسلموں میں بھی ہو،شریعت کی کسی بھی نص سے یہ ثابت نہیں کہ محض اس بنا پران کا ارتکاب مسلمانوں کے لیے حرام ہوجائے۔مثال کے طور پرآج کل بیلٹ باکس کے ذریعے خفیہ ووٹنگ ہوتی ہے۔یہ خالص ان غیر مسلموں کا فعل ہے جو قیصر وکسریٰ کے وارث وجانشین ہیں۔اگرکسی اسلامی مملکت میں بھی انتخاب کا یہی طریق کار اختیار کرلیا جائے تو یہ فعل جب بجائے خود اپنے اندر ایسی قباحت نہیں رکھتا کہ جس کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا جائے تو یہ کوئی معقول دلیل نہیں ہوگی کہ اس طریق انتخاب کو محض اس بنا پر ناجائز قرار دے دیا جائے کہ یہ خالص کافر قوموں کا طرز اور شعار ہے اور یہ کہ خلفائے راشدین اس طریقے سے منتخب نہیں کیے گئے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شاہانہ شان وشوکت میں دیکھا۔حضرت عمرؓ نے فرمایا۔اَکِسْرَوِیَّۃٌ یَا مُعَاوِیَۃُ؟''معاویہ کیا تم نے کسرویت ختیار کرلی؟''حضرت معاویہ نے جواب دیا کہ''ہم ایسی سرحد پر ہیں جہاں ہر وقت دشمن کا سامنا رہتا ہے، میں اگر اس طرح نہ کروں تو وہ ہمیں کمزور سمجھیں گے، میں ان پر اس طرح رعب ڈالے رکھتا ہوں اس میں اسلام ہی کی عزت وسربلندی ہے۔اگر آپ فرمائیں تو میں اسے ترک

کردیتاہوں'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''جب بھی میں نے تم سے کسی ایسی بات پر بحث کی ہے جس سے تم پر حرف گیری کا پہلو نکلتا ہو، تو تمہاری وضاحت کے بعد میرا حال ایسا ہو جاتا ہے کہ میں یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ میں تمہیں اس طرح کرنے دوں یا اس سے روک دوں''

(تاریخ الطبری ج/۵ ص/۳۳۱ طبع جدید۔ البدایہ والنہایہ ج/۸ ص/۱۲۴، ۱۲۵۔ مقدمہ ابن خلدون ص/۳۶۰)

علامہ ابن خلدون نے حضرت عمرؓ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا عمدہ بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

''حضرت عمرؓ، معاویہؓ کے جواب میں خاموش ہو گئے اور انہیں غلط کار نہیں ٹھہرایا کیونکہ حضرت معاویہؓ کا ایسا کرنے سے وہی مقصد تھا جو مذہب کا ہے۔ اگر حضرت عمرؓ کا مقصد سرے سے بادشاہی کا انکار ہوتا تو وہ حضرت معاویہؓ کے جواب میں صرف ''کسرویّت'' سے تعبیر یا اس کی طرف انتساب کر کے خاموش نہ ہو جاتے بلکہ وہ معاویہ کو بالکلیہ اس کے ترک کرنے کا حکم دیتے گویا اوّلاً حضرت عمرؓ نے ''کسرویّت'' سے وہی مفہوم اخذ کیا جو اس عنوان سے اہل فارس اپنے ملک میں ظلم و عدوان، باطل پرستی اور خدا سے اعراض و تغافل کر رہے تھے لیکن حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ ان کا مقصد اہل فارس کی ''کسرویّت'' اور ان کی باطل پرستی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی ان کا اصل مقصد خدا کی رضامندی ہی ہے۔ اس جواب پر حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے

اسی طرح تمام صحابہؓ کی شان تھی کہ وہ بادشاہی سے اس بناء پر گریز کرتے تھے کہ کہیں وہ باطل سے ملّوث نہ ہوجائیں (مقدمہ ابن خلدون۔فصل انقلاب الخلافۃ الی الملک۔ص/۳۶۰)

بہرحال مقصد اس تفصیل سے یہ ہے کہ عمر فاروقؓ جیسے شخص نے حضرت معاویہؓ کی ''کسرویّت''، محمود قرار دیا کیونکہ اس سے ان کا مقصد فی الواقع کسرویّت کی پیروی نہ تھی بلکہ اس سے بھی ان کا اصل مقصد دین اسلام کی سربلندی، خدا کی رضا اور مسلمانوں کی خدمت ہی تھی۔ اگر فی نفسہ اس میں کوئی قباحت ہوتی تو حضرت عمر فاروقؓ جیسا سخت گیر حاکم اس پر سکوت اختیار نہ کرسکتا تھا۔ بالکل اسی طرح اقدام ولی عہدی اور وہ بادشاہی نظام جب کہ وہ بجائے خود اپنے اندر حرمت کی کوئی وجہ نہیں رکھتا تو اسے ناجائز کہنا بھی کیوں معقول طریقہ ہوسکتا ہے۔

علامہ ابن خلدون ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''بادشاہت ان کے نزدیک اسی طرح جائز تھی جس طرح مال و دولت کا جمع کرنا اس وقت جائز ہے، جب اس میں اسراف وتبذیر سے احتراز کیا جائے۔ بادشاہت اور غلبے کو انھوں نے ناجائز امور (باطل) میں صرف نہیں کیا اور نہ اس کی وجہ سے وہ دیانت اور حق کے مقاصد سے روگردانی کے مرتکب ہوئے۔۔۔ بادشاہت حاصل ہوجانے کے بعد اس کا استعمال صحیح صحیح اور راہِ حق میں کیا جائے تو وہ قابل نکیر نہیں۔ حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام بنی اسرائیل کے بادشاہ ہی تھے، اس کے باوجود وہ راہِ حق پر گامزن اور نبّوت سے

سرفراز تھے۔۔۔

اسی طرح حضرت معاویہؓ اور یزیدؒ کے بعد مروان بن الحکم اوران کے صاحبزادے عبدالملک، یہ بھی اگرچہ ''بادشاہ'' تھے لیکن ان کی بادشاہت وہ نہ تھی جو سرکش اور برخود غلط لوگوں کی ہوتی ہے۔ مقاصد حق ہمیشہ ان کے پیش نظر رہے اور ان سے انہوں نے انحراف نہیں کیا۔ بعض دفعہ جو ایسی صورت پیدا ہوئی، اس کی وجہ ان کا یہ مقصد تھا کہ افتراق سے امت کو بچایا اور اتحاد کو قائم رکھا جائے۔ یہ مقصد ان کے نزدیک دیگر سب مقاصد سے اہم تھا۔

ہمارے اس دعوے کے ثبوت میں ان کا جذبہ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء کے واقعات نیز ان کے جو حالات و مقاصد علمائے سلف وخلف نے بیان کیے ہیں، کافی شاہد ہیں۔ امام مالکؒ اپنی کتاب ''المؤطا'' میں عبدالملک بن مروان کے طرز عمل کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ مروان تابعین کے طبقہ اولیٰ میں سے ہیں اور ان کی عدالت معروف ہے۔ پھر یہ خلافت خلیفہ عبدالملک کی اولاد کی طرف منتقل ہوگئی۔ وہ بھی دین کے لحاظ سے اونچے مقام پر فائز تھے۔ انہیں میں سے عمر بن عبدالعزیزؒ ہوئے، جنھوں نے اپنی طاقت کے مطابق پہلے خلفائے اربعہ اور صحابہؓ کے طریقے پر چلنے کی کوشش کی۔ ان کے بعد پھر ایسے بادشاہ ہوئے جنھوں نے ''بادشاہت'' کو دنیوی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اپنے سلف کے اس منہاج

کوانہوں نے چھوڑ دیا جو انہیں ہر وقت حق سے اور اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دیتا تھا۔ ان کے اس کردار نے ان کو لوگوں کی نظروں سے گرادیا۔ اور بادشاہت کوعباسیوں کی طرف منتقل کردیا۔

نیز عباسیوں میں بھی بہت سے ایسے بادشاہ ہوئے جنہیں عدالت میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ انہوں نے بھی بادشاہت کوحسب استطاعت صحیح صحیح استعمال کیا اور اس کا رخ حق کی طرف موڑ دیا۔ ان کے بعد بنوالرشید سریر آرائے خلافت ہوئے جن میں اچھے بھی تھے اور برے بھی ، پھر اس خانوادے میں ایسے حکمران آئے جو دنیا اور باطل امور میں منہمک ہوگئے اور دین کو پس پشت ڈال دیا، جس کی سزا اللہ نے انہیں یہ دی کہ خلافت کوعربوں سے چھین کر دوسروں کو دے دیا۔'' **واللہ لایظلم مثقال ذرّۃٍ** (مقدمہ ابن خلدون۔ فصل انقلاب الخلافۃ الی الملک)

ایک مصری فاضل علّامہ محب الدین الخطیب، حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی پر تبصرہ کرتے ہو لکھتے ہیں:

''خلافت، بادشاہت اور امارت یہ اصلاحی عنوانات ہیں، جن کی اصل کیفیت ان کے مدلول کے طرز عمل سے ہی معلوم ہوسکتی ہے۔ آدمی کی سیرت اور اس کا طرز عمل ہی ہمیشہ معتبر ہوتا ہے۔ حضرت معاویہؓ مسلسل ۲۰ سال خلافت راشدہ میں شام کے گورنر رہے۔ پھر بیعتِ حسنؓ کے بعد ۲۰ سال پوری

اسلامی قلمرو کے خلیفہ رہے۔ دونوں حالتوں میں انہوں نے عدل انصاف کے عَلَم کو سر بلند رکھا۔ تمام طبقات کے ساتھ نیک سلوک ان کا مقصد اور شرفاء کی تکریم اور جہلاء سے عفو درگزران کا شیوہ رہا۔ تمام امور میں پورے حزم و احتیاط اور ایمان و استقامت کے ساتھ شریعتِ محمدیہ کے احکام کی پابندی کرتے، لوگوں کو نماز خود پڑھاتے، ان کی مجالس ومحافل میں شریک ہوتے اور جنگ کے موقعے پر خود ان کی قیادت کرتے۔۔۔

جو شخص بھی حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی پر غور کرے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ شام میں ان کی حکومت عدل وانصاف، باہم رحم وشفقت اور ہمدردی و اخوت کے لحاظ سے بے مثال تھی۔ چالیس سال تک جس نے اس طرح مسلمانوں کی خدمت کی ہو۔ اور اس دوران میں مسلمان بھی ان سے خوش رہے ہوں، وہ بلاشک خلیفہ ہے۔ اور جو شخص انہیں ''بادشاہ'' کہنے پر مصر ہو، وہ بھی اس حقیقت سے انکار کی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ تمام اسلامی بادشاہوں میں سب سے زیادہ رحم دل اور صالح ترین تھے۔۔۔''

اس کے بعد علامہ محب الدین الخطیب نے علماء ومحدثین کے کتب تواریخ سے وہ تبصرے نقل کیے ہیں جو انہوں نے حضرت معاویہؓ کی سیرت وکردار کے متعلق کیے ہیں۔ انہیں نقل کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

''یہ مثالیں ہم نے اس لیے ذکر کی ہیں تاکہ لوگ یہ جان لیں کہ حضرت معاویہؓ

کی حقیقی صورت اس جھوٹی صورت سے کس قدر مختلف ہے جس کی تصویر کشی حضرت معاویہؓ کے دشمن اور اسلام کے دشمن کرتے ہیں، اس کے بعد ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ معاویہؓ کو خلیفہ اور امیر المؤمنین کہے یا ان کے ساتھ اس لقب میں بخل برتے۔ معاویہؓ اپنے عدل، علم، جہاد اور عمل صالح کی فردِ عمل لے کر خدا کے حضور جا چکے، وہ ہماری دنیا کی اس بحث سے بے نیاز ہیں کہ انہیں خلیفہ سے ملقب کیا جائے یا بادشاہ سے۔ وہ اپنی آخرت میں اس چیز سے زیادہ بے رغبت ہوں گے۔ جتنے وہ اپنی دنیوی زندگی میں پہلے رہے ہونگے'' (تعلیقات ''العواصم من القواصم''، ص ر ۲۰۷۔۲۱۰ طبع مصر)

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ سمیت تمام اسلامی خلفاء وملوک کے بارے میں آج کل یہ پروپیگنڈہ عام ہے اور جس کو ہمارے دور کے مفکرین نے آب ودانہ مُہیا کیا ہے کہ وہ شریعت سے بالکل بے پروا اور دنیوی وذاتی اغراض ومفادات کے اسیر تھے اور یہ کہ ان کی حکومتیں اسلامی حکومت کی تمام خصوصیات سے عاری تھیں، اس کا ازالہ کیا جائے۔ ہمارے ان مفکرین کو اسلامی بادشاہوں میں سوائے خرابی کے اور کوئی بات نظر نہیں آتی، ان کی خوبیاں اور کارنامے ان کو نظر نہیں آتے۔ بقول علاّمہ شبلی ؎

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندوکش تھا، ظالم تھا، سِتم گر تھا

لیکن میں عرض کروں گا کہ اسلامی بادشاہوں کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ بالکل خلاف

واقعہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ بہت سے بادشاہ اور حکمران غلط کردار کے حامل بھی ہوئے ہیں لیکن میں یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حضرت معاویہؓ سمیت تمام خلفاء وملوک اسلامی کردار سے عاری تھے اور ان کی حکومتیں نعوذ باللہ جاہلی حکومتیں تھیں یا وہ ایسی مطلق العنان بادشاہتیں تھیں جو اسلام میں ناپسندیدہ ہیں۔ میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں، دلائل وحقائق کی روشنی میں کہتا ہوں، محض عقیدت کی بنیاد پر نہیں، واقعات کی رُو سے کہتا ہوں کہ یہ عظیم ترین بہتان ہے، یہ تاریخ کا بدترین جھوٹ ہے اور یہ وہ ظلمِ عظیم ہے جو اپنوں ہی نے اپنوں کے ساتھ کیا ہے۔ بقول حفیظ جالندھری مرحوم ؎

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اس غلط دعوے کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے تاریخ پر اس طرح ظلم کیا ہے کہ رائی کو پربت بنایا۔ تل کو پہاڑ ثابت کیا۔ جُزئی کو کلیہ بنا ڈالا، اس سے بھی کام نہ چلا تو شوق الزام تراشی میں زیبِ داستاں کے طور پر اپنی طرف سے کئی چیزوں کا اضافہ کر ڈالا اور دوسرا طرفہ تماشہ کیا کہ وہ تمام مواد انہوں نے نظر انداز کر دیا جو ان کے رُخِ روشن کی نقاب کشائی کرتا ہے، ان کے کردار کی عظمت کو نمایاں کرتا اور ان کے اسلامی تشخّص کو واضح کرتا ہے۔ آہ! کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی گزشتہ چودہ صدیوں میں اچھے اور برے دونوں قسم کے حکمراں گزرے ہیں۔ اگر کچھ بادشاہ اسلامی کردار سے عاری تھے تو یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد اسلامی کردار کی حامل رہی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی انہوں نے عظیم خدمت انجام دی ہے۔ بالخصوص اُموی اور عباسی خلفاء کی اکثریت اسلامی کردار سے متّصف رہی ہے اور اسلام اور مسلمان ان کے دور میں عظمت و سربلندی سے ہمکنار۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

”دعوی کون جمیع الخلفاء کانوا مشتغلین بما ذکرہ من الخمور والفجر کذب علیھم والحکایات المنقولۃفی ذٰلک فیھا ماکذب وقدعلم ان فیھم العدل والزاھد کعمر بن عبدالعزیز والمھتدی باللہ واکثرھم لم یکن لھٰذہ المنکرات من خلفاء بنی امیّۃ وبنی العباس وان کان احدھم قد یبتلی ببعض الذنوب۔۔۔“ (منہاج السنّۃ۔ج ۲ رص ر ۱۳۷ طبع مصر)

”تمام خلفاء کے متعلق یہ دعویٰ کہ وہ شراب و کباب اور فسق و فجور میں ملوّث تھے، ان پر سراسر جھوٹ ہے۔ اس بارے میں ان کے متعلق جو حکایات منقول ہیں وہ بھی دردغ پر مبنی ہے۔ یہ واضح ہے کہ ان میں عمر بن عبدالعزیزؒ اور مہتدی باللہ جیسے عادل و زاہد خلفاء بھی ہوئے۔ اُموی اور عباسی خلفاء کی اکثریت سے ان برائیوں کا ظہور نہیں ہوا۔ اگرچہ ان میں چند ایک بعض گناہوں میں ضرور مبتلاء ہوئے۔۔۔“

# خلافت راشدہ اور مابعد کی حکومتوں میں فرق کی نوعیت

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب خلافت راشدہ کے مابعد قائم ہونے والا بادشاہی نظام بھی اسلامی خلافت کی خصوصیات کا ہی آئینہ دار تھا تو کیا وجہ ہے کہ پہلے خلفائے اربعہ کے دور کو تو خلافت راشدہ کہا جاتا ہے لیکن بعد کے دور کو خلافت راشدہ نہیں بلکہ مُلوکیّت اور بادشاہت کا دور کہا جاتا ہے۔اس تفریق کی بنیاد کیا ہے؟

اس سلسلے میں مختصراً عرض ہے کہ ایک تو اس کی بنیاد وہ حدیث ہے۔جس میں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد خلافت ۳۰ سال رہے گی **الخلافة بعدی ثلاثون سنةً** اس حدیث کے پیش نظر بعض علماء نے خلافت کے دور کی تحدید کردی۔اس کا مطلب یہ لینا کہ اس کے بعد کا دَور سراسر غیر اسلامی اور جاہلی حکومتوں کا تھا، قطعاً غیر صحیح ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے علمائے امت میں سے کسی نے بھی یہ مفہوم نہیں لیا ہے۔اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خلافت کامل صورت میں ۳۰ سال رہے گی ۔ اس کے بعد اس میں ملوکیت اور دنیا داری کی کچھ آمیزش ہوجائے گی ۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ خلافت ہی کا بالکل خاتمہ ہوجائے گا۔جس طرح کے آج کل کے بعض مفکرین باور کراتے ہیں۔

راقم کو اس حقیقت کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ کہ خلافت راشدہ میں خلفائے راشدین کا اسلامی کردار جتنا واضح اور بے غبار رہا ہے، بعد کے خلفاء وملوک کا کردار وعمل بالعموم

اُس معیار سے فروتر ہی رہا ہے۔ تاہم یہ ماننے میں سخت تأمل ہے کہ خلافت راشدہ میں شامل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جاہلیت کی آئینہ دار اور اسلامی خصوصیات سے عاری حکومتیں تھیں اور یوں مابعد دورِ حکومت کا سررشتہ خلافت اسلامیہ کے تسلسل سے کاٹ دیا جائے۔

جن عُلماء نے خلافت راشدہ اور مابعد میں تفریق کی ہے۔ اس کی بنیاد کردار و عمل کا یہی فرق ہے۔ جو خلفائے راشدین اور مابعد کے خلفاء و ملوک میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق اسلام اور جاہلیت کا نہیں، حق اور باطل کا نہیں بلکہ بہترین اور بہتر کا ہے۔ راجح مرجوح اور افضل وغیر افضل کا ہے۔

علاوہ ازیں اس کی ایک توجیہ علامہ ابن خلدون نے بھی پیش کی ہے جو اگرچہ حضرت معاویہؓ کے ضمن میں ہے۔ تاہم اس سے زیر بحث نکتے کی وضاحت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> ''مناسب یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی حکومت اور ان کے حالات اور ان سے ماقبل خلفاء کی حکومت و واقعات کے ساتھ ذکر کیے جائیں کیونکہ شرف و فضل، عدالت اور صحابیت میں وہ انہیں کے بعد ہیں اور اس بارے میں حدیث **الخلافة بعد ثلاثون سنة** کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ وہ صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ اپنے پیشرو خلفاء کے ساتھ شامل ہیں۔ مورخین نے اپنی کتابوں میں جو ان کا ذکر خلفاء سے الگ کیا ہے۔ اس کی دو وجہ ہیں اوّل یہ کہ ان کے عہد خلافت میں مغالبہ کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔

اس سے قبل وہ ایک اختیاری واجتماعی چیز تھی۔ چنانچہ مؤرخین نے دونوں حالتوں میں فرق کر دیا۔ پس معاویہؓ ان خلفاء میں سے سمجھے گئے جن میں مغالبے اور عصبیت کا پہلو شامل ہے۔ اسی چیز کو اھل الاھواء ملوک سے تعبیر کرتے ہیں اور انہیں بھی عام بادشاہوں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں حالانکہ اس بات سے اللہ کی پناہ ہے کہ انہیں مابعد کے بادشاہوں میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دی جائے وہ خلفائے راشدین میں سے ہیں اور ان کے بعد خلفائے بنی مروان اور خلفائے عباسی میں سے جو شرف وفضل اور دینداری میں ان کے مثل ہیں، وہ بھی اسی صفت میں شامل ہیں۔ بادشاہت رتبے میں خلافت سے کمتر نہیں۔

دوسری وجہ اس بات کی کہ انہیں خلفائے اربعہ کے بجائے خلفائے بنی امیہ کے ساتھ ذکر کیا گیا، یہ ہے کہ اُموی خلفاء سلسلۂ نسب کی ایک ہی کڑی سے مُنسلک تھے۔ اور ان میں سب سے نمایاں حضرت معاویہؓ تھے۔ بناں بریں اُنہیں ان کے ہم نسبوں کے ساتھ ملا دیا گیا اور پہلے خلفائے اربعہ چونکہ مختلف الانساب تھے، اس لیے انہیں ایک سلسلے میں ذکر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ اگرچہ اُموی تھے لیکن شرف وفضل میں قربت کی وجہ سے انہیں انہیں کے ساتھ شامل کر دیا گیا'' (تاریخ ابن خلدون خاتمہ جلد دوم)

# مطلوب اور نا مطلوب کی بحث

اس مقام پر ایک اور سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ کیا اسلام میں خلافیت اور ملوکیت دونوں یکساں ہیں یا ان میں سے ایک نظام مطلوب ہے۔ اور دوسرا باَمر مجبوری قابل برداشت؟

راقم کی گزشتہ وضاحتوں کو سامنے رکھا جائے تو اس سوال کا جواب بہ آسانی ممکن ہے۔ یہ بنیادی طور پر مغربی تصوّرِ جمہوریت سے تاثر پذیری کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کو جمہوریت کی نیلم پرَی کا اسیر بنانے کے لیے ملوکیت کو مطلقاً ایک خوفناک اور گھناؤنی شکل میں پیش کیا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں ملوکیت بجائے خود بری نہیں، اس کا استعمال اسے مطلوب بھی بنا سکتا ہے اور نا مطلوب بھی جس طرح ذاتی ملکیت بجائے خود اسلام میں ناپسندیدہ اور ممنوع نہیں۔ چاہے اس طرح آدمی لکھ پتی اور کروڑ پتی ہو جائے۔ یہ نجی ملکیت نا مطلوب اس وقت ہو گی جب مال و دولت کی فراوانی انسان کو جادۂ مستقیم سے ہٹا کر اسراف و تبذیر، زکوٰۃ و صدقات سے اعراض اور غریبوں کی خوں آشامی جیسی صفات مذمومہ اس کے اندر پیدا کر دے، مال و دولت کی فراوانی عام طور پر انسان کے لیے مہلک ہی ہوا کرتی ہے۔ اور بہ مشکل ہی آدمی رضا کارانہ طور پر اس کے وہ حقوق ادا کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے مال میں رکھے ہوتے ہیں۔ اس بنا پر اشتراکیّت نے ''ذاتی ملکیّت'' کو ہی بجائے خود فساد کا منبع قرار دے کر اسے افرادِ معاشرہ کے لیے ناجائز قرار دے دیا ہے۔ اس کے بالمقابل اسلام اس نقطہ نظر کو صحیح تسلیم نہیں کرتا، وہ داخلی اصلاح کے ذریعے مال و دولت کے طبعی نقصانات سے انسان کو بچانے کی

کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے اس نے مال و دولت کو سمیٹنے کی بے پایاں خواہش کی۔ سخت مذّمت اور آخرت میں اس کے لیے عذاب شدید کی وعید بھی فرمائی ہے لیکن ذاتی ملکیّت پر اس نے قدغن نہیں لگائی۔ صحابہء کرامؓ میں سینکڑوں ایسے جلیل القدر حضرات تھے جنھیں آج کل کی اصطلاح میں لکھ پتی اور کروڑ پتی کہا جا سکتا ہے لیکن اس چیز نے انہیں اسراف و تبذیر پر یا زکوٰۃ و صدقات سے اعرض پر نہیں ابھارا۔ دراں حالیکہ ''سرمایہ داری'' کی اسلام نے عام طور پر مذمت ہی کی ہے۔

اس طرح ملوکیّت کو بجائے خود فاسد کر دینا مغرب کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے، اسلام میں اس کی یہ حیثیت نہیں۔ اسلام نے اس کی اگر کہیں مذّمت کی ہے تو وہ اس کے غلط استعمال کی وجہ سے کی ہے جو عام طور پر خدانا آشنا بادشاہ کیا کرتے ہیں۔ کوئی بادشاہ اگر اس کا صحیح استعمال کرے، ملوکیّت کو وہ خدا کے احکامات کو نافذ کرنے، منکرات کو روکنے اور خدا کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزاد کرا کے صرف خدائے واحد کا بندہ بنانے کے لیے استعمال کرے تو یہ ملوکیّت مذموم نہیں، بالکل اسی طرح مطلوب ہے۔ جس طرح اسلام میں ابوبکر صدیقؓ اور عثمانؓ کی ''سرمایہ داری'' مذموم نہیں' مطلوب ہے۔ علاّمہ ابن خلدون اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ بادشاہت جو غلبۂ حق، مصالح عامّہ اور لوگوں کو دین حق پر چلانے کی خاطر ہو، شارع کی نظر میں مذموم نہیں۔ شارع نے اس کی جو کہیں مذمّت کی ہے۔ وہ اس پہلو سے ہے کہ جب اسے باطل کے غلبے کے لیے اور لوگوں کو اپنی

اغراض وشہوات کے مطابق کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔کوئی بادشاہ اگر مخلص ہواور بادشاہت سے اس کا مقصد محض رضائے الٰہی کی خاطر لوگوں کی بھلائی، ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلانا اور اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرنا ہوتو یہ مذموم نہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے ایسی بادشاہت کے حصول کے لیے دعا مانگی ہے (جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے) **رب هب لی ملکا لا ینبغی لأحد من بعدی** ''یا اللہ مجھے ایسی بادشاہت عطافرما جو میرے بعد کسی کو نہ ملے'' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میری نبوت و بادشاہت کا مصرف باطل نہیں ہوسکتا'' (مقدمہ ابن خلدون۔فصل انقلاب الخلافۃ الی الملک)

ایک دوسرے مقام پر علامہ لکھتے ہیں:

''واضح رہے کہ شریعت نے بذاتہٖ ملوکیت کی نہ مذمت کی ہے نہ اس کے قیام سے منع کیا ہے، البتہ ان کے اس مفاسد کی مذمت کی ہے جو اس سے ظہور پذیر ہوتے ہیں جیسے قہر، ظلم اور تمتع باللذات۔ یہ اس کے توابع ہیں جو بلاشک ممنوع ہیں۔اسی طرح اس نے عدل وانصاف، دین کے شعائر، مراسم کا قیام اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی تعریف کی ہے نیز اس کے بدلے میں ثواب کی بشارت بھی دی ہے، یہ چیزیں بھی بادشاہت کے توابع ہیں۔پس شریعت جب بادشاہت کی مذمّت کرتی ہے تو اس سے مراد اس کی پہلی حالت ہے، نہ کہ یہ دوسری۔ بادشاہت کی فی نفسہ شریعت نے نہ مذمّت کی ہے اور نہ اس کے ترک

کرنے کا مطالبہ کیا ہے، اس نے بعض چیزوں کی جو مذمّت کی ہے اس کا مقصد اس سے اس چیز کا بالکلیہ ترک نہیں، اس سے اس کا اصل مقصد اس کا رُخ حق کی طرف موڑنا ہے'' (مقدمہ ابن خلدون۔فصل اختلاف الامۃ فی حکم منصب الخلافۃ وشروطہ)

لہٰذا ملوکیت کے متعلق یہ دعویٰ کہ وہ صرف قابلِ برداشت ہے، مطلوب نہیں، صحیح نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بعض صورتوں میں وہ خلافت بھی نامطلوب وناپسندیدہ ہوسکتی ہے جو طریقۂ ولی عہدی کی بجائے عوام کی آزادانہ رائے سے قائم ہو لیکن خلیفہ کا کردار اس سے مختلف ہو جس کا اسلام اس سے تقاضا کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک طریقۂ ولی عہدی سے قائم ہونے والی بادشاہت کا حکمران ٹھیک ان اصولوں کے مطابق حکمرانی کرتا ہے جس کی اسلام نے ہدایت کی ہے۔ جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور ان جیسے دیگر خلفاء وملوک ہیں۔ ایسے نیک، عادل اور خداترس حکمرانوں کی ''ملوکیت'' محض قابلِ برداشت نہیں، عین مطلوب ہے۔ یہاں مطلوب اور نامطلوب اور یکساں وغیر یکساں کی بحث ایسی ہی مغالطہ انگیز ہے جیسے آج کل اشتراکیت زدہ حضرات موجودہ سرمایہ داروں کا کردار پیش کر کے سوال کریں کہ اسلام میں حضرت ابوذر کا فقر مطلوب ہے یا قارون کی سرمایہ داری یا دونوں ہی اسلام میں یکساں ہیں؟ ظاہر ہے سوال کی یہ تکنیک فریب اور مغالطے پر مبنی ہے۔ ایک عام شخص اس کا یہی جواب دے گا کہ اسلام میں فقرِ ابوذر ہی مطلوب وپسندیدہ ہے دراں حالیکہ سرمایہ داروں میں سب قارون ہی نہیں ہیں، ان میں عثمانؓ اور ابوبکرؓ بھی ہیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ وزبیر، یعلیٰ بن امیہ اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ ابن خلدون، فصل انقلاب الخلافۃ الی الملک)

حضرت علیؓ کے فقر کی داستانیں بہت مشہور ہیں لیکن معتبر روایات اس کے برعکس ہیں۔ وہ بھی اپنے مزاج وطبیعت کی سادگی اور زہد کے باوصف ''سرمایہ دار'' تھے۔ پانچ مختلف مقامات پر ان کی زرعی زمینیں تھیں جن میں سے چار خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں عطا فرمائی تھیں اور بعد میں ایک حضرت عمرؓ نے عطا کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت ان زمینوں کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ دینار تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی ذرائع آمدنی تھے۔ تمام آمدنی کی سالانہ زکوٰۃ خود حضرت علیؓ کے بقول چالیس ہزار دینار نکلتی تھی۔ (ملاحظہ ہو السنن الکبریٰ للبیہقی ج/۶، ص/۴۴، کتاب الخراج یحیی بن آدم، ص/۸۷، ۸۳، فتوح البلدان ص/۲۰، البدایۃ والنہایۃ ج/۷، ص/۳۲۵)

اسی طرح اور بھی بہت سے صحابہ اصحابِ ثروت تھے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی کڑی حکیم محمد سعید صاحب جیسے حضرات ہیں جنہوں نے اپنی ساری دولت اور سرمائے کو ملی کاموں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ **کثر اللہ أمثالھم فینا**

ان کی سرمایہ داری کو کون مذموم کہہ سکتا ہے؟ اسلام کی نظر میں ان حضرات کی سرمایہ داری بھی عین مطلوب اور پسندیدہ ہے۔ اسی طرح حضرت معاویہؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے بادشاہوں کی ملوکیت بھی اسلام میں ناپسندیدہ نہیں۔ صرف وہ بادشاہت ناپسندیدہ ہے جو انسان کو خودسر اور خدائی ہدایات واحکامات سے بے پروا بنا دے۔ جس طرح سرمایہ داری نہ مطلقاً مذموم ہے نہ محمود۔ اس کا استعمال اسے مذموم بھی بنا سکتا ہے اور قابلِ تعریف بھی۔ اسی طرح ملوکیت نہ مطلقاً مذموم ہے نہ محمود، اس کا استعمال اسلام کی نگاہ میں اسے مطلوب ومحمود بھی بنا سکتا ہے اور مذموم ونامطلوب بھی۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ اسلامی خلفاء وملوک کی بادشاہت کو مطلقاً مذموم قرار دے کو تمام مسلمان بادشاہوں کو بلا استثنا گردن زدنی باور کرنا صحیح نہیں ہے۔ ان میں اچھے اور برے دونوں طرح کے بادشاہ گزرے ہیں، اچھے کو اچھا کہا جائے اور بروں کو برا۔ محض بادشاہی نظام کی وجہ سے حضرت معاویہؓ سمیت تمام اسلامی بادشاہوں کو برا کہنا عقل وانصاف سے بعید تر بات ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ سلطانی جمہور کے اس دور میں بادشاہت کی یہ تائید وحمایت عجیب بات ہے تو عرض ہے کہ پاکستان میں کوئی بادشاہی نظام قائم ہونے نہیں لگا ہے کہ اس کے جواز اور تائید کے لیے دلائل فراہم کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے بلکہ یہ تحریر احتجاج ہے اس ظلم کے خلاف جو آج کل کے بہت سے مفکرین اسلام نے خلافت وجمہوریت اور ملوکیت کی بحث کے ضمن میں بلا استثناء تمام مسلمان بادشاہوں کے ساتھ کیا ہے۔ اور یوں ۳۰ سالہ دور خلافت اور ڈھائی سالہ خلافت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نکال کر پوری تاریخِ اسلام کو ظلم و ناانصافی، جبر تشدد اور تحکم ودھاندلی کی تاریخ باور کرایا ہے۔ اور اپنے نقطۂ نظر کی تائید کے لیے قصرِ صحابیت تک میں نقب لگانے میں انہیں تأمل نہیں ہوا۔ اور حضرت عثمان غنیؓ سے لے کر حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت معاویہؓ وغیرہم جلیل القدر صحابہ بھی ان کی ناوک افگنی سے محفوظ نہیں رہے۔ ان مفکرین نے مذکورہ نفوس قدسیہ کی سیرت وکردار کو اس طرح مسخ کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں قرآن کریم کی وہ مدح ومنقبت، جو ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں کی گئی ہے ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کردہ

فضائل نری داستان سرائی۔ تاریخ اسلام کے یہ مظلوم ان مفکرین کو خطاب کرکے بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں۔

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

# ہمارا نقطۂ نظر اور اس کے ثمرات حسنہ

بہرحال خلاصہ سابقہ گفتگو کا یہ ہے کہ اسلام کا نظام خلافت صرف ۳۰ سال چل کر ختم نہیں ہوگیا۔ بلکہ اسلامی نظام اور اس کی عملداری اس کے بعد بھی صدیوں تک قائم رہی ہے۔ اسلامی خلفاء وملوک اپنی بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوصف بحیثیت مجموعی اسلامی احکام و شعائر کے پابند رہے اور ان کے ادوارِ حکومت میں اسلامی قوانین کا پرچم سربلند رہا۔ کسی بھی اسلامی بادشاہ نے سوائے ایک مغل فرماں روا اکبر کے' دین اسلام سے بغاوت نہیں کی۔ اس لیے یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد ''ملوکیت'' کے آتے ہی اسلامی حکومت کی تمام امتیازی خصوصیات اسی طرح ختم ہوگئیں جس طرح سورج کے طلوع ہوتے ہی رات کی تاریکی معدوم ہوجاتی ہے بلکہ یہ خصوصیات دورِ ملوکیت بالخصوص حضرت معاویہؓ کے دور میں بھی بدستور موجود رہی ہیں۔ جنہیں آج کل کے مفکرین ملوکیت کا بانی اور اسلامی حکومت کی تمام امتیازی خصوصیات کو مٹانے والا باور کرا رہے ہیں۔ اور تاریخ اسلام میں بیسیوں ایسے ''بادشاہ'' ہوئے ہیں جن کی ''ملوکیت'' انہی خصوصیات کی آئینہ دار تھی جو خلافت کی بتلائی جاتی ہے۔

حضرت معاویہؓ وغیرہ کے متعلق کتب تواریخ کی بعض ظاہری روایات سے جو یہ تاثر آج کل دیا جارہا ہے کہ ان کے دور میں (نعوذ باللہ) اسلامی حکومت کی تمام امتیازی خصوصیات کو مٹا کر رکھ دیا گیا تھا۔ یہ تاثر قطعاً خلاف واقعہ اور بے بنیاد ہے۔ یہ حقائق و واقعات کے برعکس تخیل وتصورات کا ایسا آشیانہ ہے جو شاخ نازک پر قائم کیا گیا ہے۔ جو بادِ تحقیق کے ایک ہی جھونکے

سے زمیں بوس ہوجاتا ہے۔اس قسم کے کمزور سہاروں پرتو پھراسی قسم کا دعویٰ خلافتِ راشدہ کے نصف آخر دورِعثمانؓ وعلیؓ کے متعلق بھی کیا جاسکتا ہے۔ ''تحقیق'' کی یہ رَوچل نکلی تو شاہدِ تحقیق کی عشوہ طرازیوں سے حضرت عثمانؓ وحضرت علیؓ کو بچانا بھی مشکل ہوجائے گا۔

راقم کے پیش کردہ نقطۂ نظر کے جونتائج نکل سکتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔حضرت معاویہؓ وغیرہ جلیل القدر صحابہ کرام کے اقدامات کی ایسی معقول توجیہ ممکن ہے جس سے ان کا شرف صحابیت مجروح نہیں ہوتا۔مسلمانوں کو ان سے جوعقیدت اور حسن ظن ہے، وہ باقی رہتا ہےاورسب سے بڑھ کر قرآن وحدیث نے ان کی جوصفات بتلائی ہیں، ان کی نفی نہیں ہوتی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین

۲۔موجودہ نسل کے ذہن میں اپنے اسلاف سے نفرت کی بجائے ،محبت وعقیدت پیدا ہوگی اوران کی نگاہیں اپنے حال و مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے غیروں کی طرف نہیں بلکہ اپنے ان اسلاف ہی کی طرف اٹھیں گی جو اپنی بعض کوتاہیوں کے باوصف مسلمان اور اسلامی عظمتوں کے علمبردار تھے جو ہمیشہ اسلام کی طرف ہر اٹھنے والے ہاتھ کو قلم اوراس کی طرف اٹھنے والے قدموں کو شَل کردیتے رہے۔ **رحمه الله رحمة واسعة**

۳۔اورسب سے بڑھ کر اسلام کا نظام حکومت ''عنقا صفت'' نہیں رہتا کہ جس کی جھلک دنیا نے ۳۰سال بلکہ ۱۲، ۱۳سال ہی (عمر فاروقؓ کی شہادت تک) دیکھی ہو۔اس کے بعدوہ ایک فرقے کے امام غائب کی طرح ایسا روپوش ہوگیا کہ جس کو دوبارہ منظرعام پر دیکھنے کے لیے چودہ صدیاں بیت گئیں اور دیکھتے دیکھتے تمام مسلمانوں کی آنکھیں بھی پتھرا گئیں ہوں بلکہ

اسلام کا نظام حکومت ایک متحرک، جاندار اور ہر دور میں قابل عمل نظر آتا ہے کیوں کہ فترات کے ساتھ ساتھ وہ ہر دور میں اپنی صحیح روح کے ساتھ روبہ عمل رہا۔ حتی کہ اس دور میں بھی وہ سعودی عرب میں روبہ عمل، اپنی قوت اور تازگی کی شہادت دے رہا ہے۔ مختلف وقتوں میں بعض بادشاہوں کے غلط طرز عمل کے نتیجے میں اسلامی حکومت کی خصوصیات کے بہت سے نقوش دھندلاتے ضرور رہے ہیں تاہم ان کی کچھ نہ کچھ چھاپ پھر بھی ہر دور میں نمایاں رہی ہے۔ زوال وتغیر ایک فطری عمل ہے جس سے دنیا کی کوئی چیز مستثنیٰ نہیں ہوسکتی جس کا وجود محض چند روزہ نہیں، صدیوں تک رہتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون یا نظام ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا جس پر مرور ایام اور گردش لیل ونہار نے زوال وتغیر کا کچھ نہ کچھ سایہ نہ ڈالا ہو۔ اسلامی نظام حکومت نے تیرہ صدیاں دنیا پر حکمرانی کی ہے۔ یہ کوئی تھوڑا عرصہ نہیں۔ بڑا طویل راستہ ہے جو قطع کر کے ہم تک پہنچا ہے۔ یہ قطعاً ناممکن تھا کہ اتنی طویل صدیوں میں اس پر تغیر کا کوئی وار نہ ہوتا یا اگر ہوتا تو وہ اسے سہہ جاتا اور اس کا کوئی اثر قبول نہ کرتا۔ اس پر بڑے بڑے تغیرات آئے، متعدد مرتبہ اس کی زندگی تک خطرے میں پڑ گئی لیکن پھر کوئی مردِ درویش آتا، مردے از غیب ظہور پذیر ہوتا اور اس کی عروقِ مردہ میں تازہ خون دوڑا کر اس کو حیات نو بخش دیتا۔ پس اس کی کوتاہیوں اور خامیوں کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کر دینا یا ایسا طرزِ فکر اختیار کرنا جس سے یہ تأثر قائم ہو کہ اسلامی نظام حکومت صرف ۳۰ سال ہی چلا، اس کے بعد سے آج تک روئے زمین پر کہیں (سوائے عمر بن عبدالعزیزؒ کے مختصر دور کے) یہ اپنی اصلی صورت میں قائم نہ ہوسکا، یاس انگیز طرز عمل ہے جس سے مسلمانوں کی موجودہ نسل کے دل ودماغ سے اسلامی حکومت کے قیام کے جذبے کا ہی

سرے سے مفقود ہو جانے کا خطرہ ہے۔اس کے برعکس راقم کے پیش کردہ نقطۂ نظر سے وہ اب بھی اسی طرح قابل عمل ہے جس طرح پچھلے ادوار میں وہ وقتاً فوقتاً روئے زمین پر اپنی روح کے ساتھ جلوہ گر رہا ہے۔اس سے قوم کے اندر مایوسی کی لہر نہیں بلکہ ان کے اندر امیدوں کے چراغ روشن ہوں گے، ان کے جذباتِ عمل ٹھٹھریں گے نہیں بلکہ اور ابھریں گے اور اسلامی حکومت کا قیام انہیں ناممکن نہیں بلکہ عین ممکن نظر آئے گا۔

# دورِ حاضر کے مفکرین کا نقطۂ نظر اور اس کے خطرناک نتائج

اس کے برعکس ان حضرات اہل علم کا، جن کی فکری غلطیوں کی نشاندہی اس مقالے میں کی گئی ہے، نقطۂ نظر حسب ذیل ہے:

ا۔ اسلام کا نظام حکومت (خلافت) تھوڑے ہی عرصے بعد ''ملوکیت'' میں تبدیل ہو گیا اور اس کا آغاز بھی حضرت عثمانؓ کے اقدامات سے ہوا کہ انہوں نے اکابر صحابہ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو فائز کیا، مزید برآں ان کے ساتھ خصوصی مراعات برتیں، مسلمانوں کے مشترکہ بیت المال سے اپنے رشتہ داروں کو خاص طور پر عطیے دیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں ''ملوکیت'' کے اس رجحان کو، جس کی بنیاد حضرت عثمانؓ رکھ گئے تھے۔ روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور معاویہؓ کے خلیفہ بنتے ہی نظام خلافت ختم ہو گیا۔

۲۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے دور حکومت میں (۶۰ ھ تک) اسلامی حکومت کی تمام امتیازی خصوصیات کو مٹا کر رکھ دیا اور اس کی جگہ ایک آمرانہ و مستبدانہ نظام حکومت قائم کیا، جو ہر اسلامی خصوصیت سے عاری اور ہر جاہلی و دنیوی حکومت کی خصوصیات کا آئینہ دار تھا۔ اس وقت سے لے کر مصطفی کمال پاشا کے الغائے خلافت تک باستثنائے عمر بن عبدالعزیزؒ اسلام میں یہی نظام ملوکیت قائم چلا آیا۔

۳۔مزید برآں اس ضمن میں ان حضرات اہل علم نے حضرت عثمانؓ ، حضرت عمرو بن العاصؓ ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ، حضرت معاویہؓ ، حضرت عائشہؓ اور حضرات طلحہ و زبیر وغیرھم رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کردار کو جس بری طرح مسخ کر کے پیش کیا ہے وہ ایک الگ دلخراش داستان ہے جیسا کہ پہلے بھی میں نے اشارہ کیا ہے۔

اس نقطۂ نظر اور طرز عمل کے جو نتائج نکل سکتے ہیں اور نکل رہے ہیں وہ درجِ ذیل ہیں:

ا۔صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ردائے تقدس وعظمت تار تار ہوگئی ہے۔عقیدت وحسن ظن کی جگہ نفرت وسوءظن نے لے لی ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ دشمنانِ صحابہ کو ایک مضبوط بنیاد فراہم ہوگئی ہے۔اب یہ ڈیوٹی صرف ایک مخصوص فرقے کی ہی نہیں رہی کہ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو برا کہیں، اہل سنت میں سے بھی ہر کہ ومہ حضرت معاویہؓ وغیرہ پر تنقید کرنے لگا ہے۔جیسے وہ ایک ایسے عام انسان تھے، جن میں کوئی خوبی نہ تھی، البتہ وہ برائیوں کا مجموعہ تھے۔صحابہ کرام کے اس کردار میں، جسے قرآن وحدیث نے بیان کیا ہے۔اور اِس کردار میں، جسے مذکورہ اہل علم نے اپنی ذہانت اور قوت تخلیق سے پیکر وجود عطا کیا ہے، تطبیق ناممکن ہوگئی ہے۔ایک کو صحیح ماننے کی صورت میں لازماً دوسرے کی تکذیب کرنی پڑتی ہے۔ بیک وقت دونوں کی صحت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

جب اسلام کے نظام حکومت کو خود حضرت عثمانؓ وحضرت معاویہؓ وغیرھم نے ختم کر دیا اور دوسرے تمام صحابہؓ نے بھی اس چیز کو خاموشی سے برداشت کرلیا، پیغمبر اسلام کے تربیت یافتہ اصحاب اس کو پورے ۳۰ سال بھی اصلی صورت میں قائم نہ رکھ سکے، حضرت علی نے اگر کچھ

کوشش کی بھی تو صحابہ کرامؓ نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ بلکہ حضرت حسنؓ نے تو بالکل گھٹنے ٹیک دیے۔ اور اس کے بعد سے آج تک اسلام کے نام پر ''ملوکیت'' نافذ ہے جس میں اسلامی حکومت کی کوئی خوبی موجود نہیں ہے۔ اس سے لازماً یہ احساس مایوسی ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ اب اسلامی حکومت کا قیام قطعاً ناممکن ہے۔ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک قائم شدہ نظام خلافت کو برقرار نہ رکھ سکے تو اب وہ کون مسیحا نفس ہے جو اس نظام کو از سر نو احیاء عمل میں لا سکے؟

۳۔ اس سے ان متجددین و مستشرقین کے اس سازشی ذہن کی تائید ہوتی ہے جو یہی کہتے ہیں کہ اسلام کا نظام حکومت ایک خاص دور اور ایک خاص ماحول کے لیے تھا جو اپنی زندگی کے ۳۰ سال پورے کر کے ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کے احیاء کی آرزو کو سینوں سے چمٹائے رکھنا دانش مندی نہیں۔ آج کل اس دور کے جدید تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کو اپنا نظام حکومت مرتب کرنا چاہیے۔

# بگاڑ کے اسباب

ایک اور بنیادی غلطی بعض مفکرین کی یہ ہے کہ اسلام کے نظام حکومت میں بگاڑ کا واحد سبب انہوں نے ''ملوکیت'' کو قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ملوکیت قائم نہ ہوتی تو نظام خلافت اپنی صحیح صورت میں قائم اور اسلام کا نظام سیاست بگاڑ سے محفوظ رہتا۔ لیکن یہ دعویٰ بھی بنیادی طور پر غلط ہے۔

کیوں کہ ایک تو اس سے ملوکیت کا فی نفسہ مذموم ہونا لازم آتا ہے۔ حالانکہ ملوکیت بجائے خود مذموم چیز نہیں۔ بعض انبیاء بھی ملوک رہے ہیں۔ اور قرآن نے ان کی ملوکیت کا تذکرہ اچھے انداز میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی تاریخ میں بھی عمر بن عبدالعزیزؒ اور ان جیسے بہت سے عمدہ کردار کے بادشاہ ہوئے ہیں۔ جن کی ملوکیت کو مذکورہ حضرات اہل علم بھی مستحسن تسلیم کرتے ہیں۔ اگر ملوکیت بجائے خود مذموم چیز ہوتی تو اس نظام مملکت کے تحت کسی بھی بادشاہ کو صحیح سیرت اور اسلامی کردار کا حامل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ یہ حضرات محض ملوکیت کی وجہ سے ہی حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو بھی اسلامی سیرت و کردار سے عاری باور کرانے پر مصر ہیں۔

ثانیاً اگر ''ملوکیت'' ہی بگاڑ کا واحد سبب ہے تو پھر اس کی کیا معقول توجیہ کی جائے گی کہ بگاڑ کا آغاز خود یہ حضرات حضرت عثمانؓ کے سیاسی اقدامات سے کرتے ہیں اور انہیں فسادِ احوال کا سبب گردانتے ہیں حالانکہ یہ خلافت راشدہ کا دور ہے، ملوکیت ابھی نہیں آئی ہے۔ سوال یہ

ہے کہ خود ان کی تصریحات کے مطابق خلافت راشدہ میں یہ بگاڑ کیوں آیا؟ حضرت علیؓ کا پورا دورِ خلافت خانہ جنگی اور دیگر انتشار و خلفشار میں گزرا۔ یہ بھی سیاسی بگاڑ ہی ہے یہ بگاڑ خلافتِ راشدہ میں کہاں سے آیا؟ اگر بگاڑ کا واحد اہم سبب صرف ملوکیت ہے تو پھر خلافت راشدہ کو کم از کم سیاسی بگاڑ سے محفوظ رہنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے بگاڑ خلافت راشدہ کے دور میں بھی آیا ہے جس کی وجہ سے خلافت راشدہ کا نصف آخر اپنے نصف اول سے قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ تجزیہ کہ ملوکیت ہی بگاڑ کا سبب ہے، صحیح نہیں۔

دراصل غلطی کی بنیادی وجہ ان کا یہ خیال ہے کہ بگاڑ صرف سیاست (نظام حکومت) میں آیا ہے۔ باقی اخلاقیات، معاملات اور عبادات کے تمام شعبے بدستور اسی ڈگر پر تھے جس پر ابوبکرؓ وعمرؓ کے دور میں تھے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بگاڑ اوّلاً معاشرتی حالات و اخلاقیات اور افرادِ ملک کے طبع ورجحان میں آتا ہے۔ سیاست اخلاقیات ہی کا ایک شعبہ ہے۔ اس لیے ملک و معاشرے کا جو عمومی مزاج ہوگا، یہ ناممکن ہے کہ حکومت کا مزاج اس سے مختلف ہو۔ سیاست (نظام حکومت) کا ضمیر ہمیشہ اہل ملک کے مزاج و کردار سے اٹھتا ہے۔ اگر افراد ملک کا عمومی مزاج و کردار فاسقانہ ہوگا تو اس سے جو نظام حکومت جنم لے گا، وہ غیر صالح ہوگا، صالح کبھی نہیں ہوسکتا۔ کافرانہ مزاج کے معاشرے سے متشکل ہونے والا نظام حکومت ہمیشہ کافرانہ مزاج کا حامل ہوگا۔ تاریخ میں اس کی مثالیں تو آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں نے باہر سے حملہ کر کے کسی غیر اسلامی ملک کو فتح کر کے وہاں اسلامی حکومت قائم کر لی۔ لیکن ایسی کوئی مثال تاریخ پیش نہیں کر سکتی کہ کسی غیر اسلامی ملک و معاشرے سے از خود کسی صالح اور اسلامی نظام حکومت نے جنم لیا

ہو۔گویا نظام حکومت کے مزاج کو بنانے میں ملک و معاشرہ کا مزاج اصل کردار ادا کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے جتنے ممالک بھی فتح کیے اور وہاں اسلامی نظام حکومت نافذ کیا گیا، اس مفتوح ملک کے افراد باوجود قبول اسلام کے چونکہ اس معاشرے کے افراد کی طرح نہیں تھے جس معاشرے کی بنیاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تھی۔اس لیے وہاں کا نظام حکومت بھی باوجود اسلامی ہونے کے کبھی اس اسلامی نظام حکومت کے مماثل نہ ہوسکا جسے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ نے مکی ومدنی معاشرے میں نافذ کیا تھا۔تمام ممالک مفتوحہ میں قائم کردہ اسلامی نظام حکومت کے اندر اپنے اپنے ماحول، معاشرے کے مزاج اور وہاں کے مخصوص رجحانات کے کچھ نہ کچھ غیر اسلامی اثرات ضرور پائے جاتے ہیں۔

حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا ''یہ کیا بات ہے کہ آپ کے عہد خلافت میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ابوبکرؓ وعمرؓ کے عہد میں ایسا نہیں ہوا؟'' حضرت علیؓ نے جواب میں فرمایا:

''ابوبکرؓ وعمرؓ کے عہد کی رعایا مجھ جیسے افراد پر مشتمل تھی اور میری رعایا تم جیسے لوگوں پر مشتمل ہے۔'' (مقدمہ ابن خلدون ص ر ۳۴۷، فصل ولایت عہد)

حضرت علیؓ کے اس فرمان سے اس نکتے کی وضاحت خوب ہوجاتی ہے۔جس کی طرف خاکسار اشارہ کررہا ہے۔

اس حقیقت سے مجالِ انکار نہیں اور تاریخ اسلام اس بات کی شاہد ہے کہ نبی امی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسلامی معاشرہ بحیثیت مجموعی مائل بہ انحطاط وتغیر ہی ہے اور ان کے ماننے

والوں کی ایمانی وقلبی حیثیت بھی اسی حساب سے بتدریج زوال پذیر ہے۔ اس انحطاط وزوال کے اثرات دور صحابہ سے ہی نمایاں ہونے شروع ہوگئے۔ اس کا مطالعہ آپ اس طرح کر کے دیکھیں کہ جو دور زمانہ نبوت سے جتنا متصل ہے، اسی حساب سے اس میں بہ اعتبارِ ادوار تغیر مابعدٗ بھی زیادہ افزوں تر ہے اور جو دور، زمانۂ نبوت سے جس قدر دور ہے اسی قدر اس میں خیر و برکت میں کمی پیدا ہوتی چلی گئی ہے۔ اسی چیز کو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے اس طرح ادا فرمایا ''**خیرا القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم۔ الحدیث**'' کہ سب سے بہتر میرا دور ہے۔ دوسرے نمبر پر وہ جو اس کے بعد میرے دور سے متصل ہے۔ تیسرے نمبر پر وہ جو اس کے بعد ہے ایک دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''**لا یأتی علیکم زمان إلا الذی بعده شر منه** (صحیح بخاری، کتاب الفتن)'' ایک زمانہ گزر جانے کے بعد جب تم پر دوسرا زمانہ آئے گا، وہ پہلے کی بہ نسبت بدتر ہوگا'۔ اور متعدد حدیثوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نکتے کی وضاحت فرمائی ہے کہ بُعدِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدعملی، بُخل، قتال وجدال، شہادت زُور اور دیگر صفات مذمومہ میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ حافظ ابن حجرؒ اس قسم کی احادیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ خرابیاں، جن کی خبر ان احادیث میں دی گئی ہے۔ عہد صحابہؓ سے ہی ان کی ابتدا ہوگئی تھی۔ پھر بعض جگہوں پر ان میں اضافہ ہوگیا اور جوں جوں قیامت قریب آئے گی، ان خرابیوں میں استحکام پیدا ہوگا۔ خرابیاں تمام شہروں میں روز افزوں ہیں، کہیں کم کہیں زیادہ۔ جب ایک طبقہ ختم ہوجاتا ہے، اس کی جگہ

لینے والے دوسرے طبقے میں بہ نسبت پہلے کے بہت زیادہ نقص واقع ہوجاتا ہے“ (فتح الباری، باب ظہور الفتن)

مولانا ابوالکلام آزاد مرحومؒ لکھتے ہیں:

”نبوت ورحمت کی برکات کی محرومی وفقدان کا ایک تدریجی تنزل تھا اور بدعات وفتن کے ظہور واحاطہ کی ایک تدریجی ترقی تھی، کالحصیر عوداً عوداً۔ جو حضرت عثمانؓ کی شہادت سے شروع ہوئی اور جس قدر عہد نبوت سے دوری بڑھتی گئی اتنی ہی عہد نبوت اور خلافت رحمت کی سعادتوں سے امت محروم ہوتی گئی۔ یہ محرومی صرف امامت وخلافتِ کبریٰ کے معاملے ہی میں نہیں ہوئی بلکہ قوام ونظامِ امت کے مبادیات واساسات سے لے کر حیات شخصی وانفرادی کی اعتقادی و عملی جزئیات تک ساری باتوں کا یہی حال ہوا۔“ (مسئلہ خلافت ص ر ۱۴)

مطلب ان احادیث، اقوال اور عبارتوں کا یہ ہے کہ بگاڑ کا عمل تدریجی تھا اور اس کا رخ صرف سیاسیات (نظام حکومت) ہی کی طرف نہ تھا بلکہ زندگی کے تما شعبوں میں یہ اپنی رفتار سے آنا شروع ہوگیا تھا۔ اخلاقیات، عبادات، معاملات، معیشت ومعاشرت اور تہذیب وتمدن سب پر ہی اس نے اپنا اثر کیا۔ حکمران واہلِ کارانِ حکومت بھی معاشرے ہی کے فرد ہوتے ہیں۔ نظام حکومت چلانے کے لیے وہ آسمانوں سے نازل نہیں ہوا کرتے ہیں۔ معاشرے کے اچھے برے اثرات سے وہ خود کو پوری طرح محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ غیر شعوری طور پر معاشرے کے اثرات ان کے اندر بھی اپنا اثر دکھاتے ہیں۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادوارِ مابعدِ رسالت پر نظر ڈالیے کہ حضرت ابوبکرصدیقؓ کا دور خلافت زمانۂ رسالت سے بالکل متصل ہے۔ اس بناء پر وہی دور فیوض وبرکاتِ الٰہیہ کا سب سے زیادہ مظہراور عام معاشرہ صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمہ گیر اثرات میں پختہ تر ہے۔جس کی وجہ سے خلافت صدیقی میں ذیل کی خصوصیات نمایاں تھیں:

☆ تمام مسلمانوں میں اتحاد واتفاق اور کامل یگانگت ہے۔ حاکم ومحکوم،راعی ورعایا اور امیر وغریب سب اشاعت اسلام اوراستیصالِ کفر کے جذبے سے سرشار ہیں۔

☆ دینی مسائل واحکام میں مسلمانوں میں باہم کوئی قابل ذکر نزاع پیدانہیں ہواحتی کہ سیاسیات میں بھی شدت اختلاف کی کوئی نمایاں مثال نہیں ملتی۔

☆ دنیا سے بے رغبتی اورفکر آخرت کا کم وبیش وہی حال ہے جوخود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دورِ مبارک میں تھا۔

☆صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرب اورزمانۂ رسالت کے اتصال ہی کا ایک پرتَو یہ تھا کہ خود خلیفۃ الرسول ابوبکرصدیقؓ اپنے سیاسی ودینی اجتہادات میں خطا سے سب سے زیادہ محفوظ رہے، گُو اوّلاً حضرت ابوبکرصدیقؓ کے اجتہادات اورسیاسی آراء میں بعض حضرات نے اختلاف اور توقُّف کیالیکن بالآخرانہوں نے بھی بعد میں ان کے موقف کی تائیدوتصویب کی۔

☆ ملک ومعاشرہ داخلی انتشار،شرپسند عناصر اورسازشی گروہ کی آماجگاہ بننے سے محفوظ اوران کی دسیسہ کاریوں سے مامون رہا۔

## دورفاروقی میں:

مذکورہ حالت میں اگر چہ کوئی نمایاں فرق واقع نہیں ہوا تاہم وہ کیفیت نہ رہی جو دور صدیق میں تھی۔زمانۂ رسالت سے بُعد کے تناسب سے حالات میں ضرور کچھ تغیر آیا، گو بوجوہ وہ زیادہ نمایاں نہ ہوسکا۔

## دورعثمانیؓ میں:

عوامی اتحاد میں کسی حد تک رخنہ، دنیاوی چیزوں میں ایک گونہ رغبت اور دینی وسیاسی مسائل کے نزاع میں قدرے شدت ظہور پذیر ہوگئی اوراجتہادی وسیاسی آراء میں حضرت عثمانؓ امکانِ خطا سے اپنے پیشروؤں ابوبکرؓ وعمرؓ کی طرح محفوظ نہ رہ سکے۔سب سے بڑھ کر ملک ومعاشرہ شرپسند عناصراورسازشی گروہ کی دسیسہ کاریوں سے غیرمحفوظ ہوگیا۔

## دورعلیؓ میں:

زمانۂ رسالت کے مزید بُعد کی وجہ سے تغیرات نمایاں اورواضح ہوکر سامنے آگئے۔ اتحادواتفاق کی جگہ باہمی خانہ جنگی سے اشاعت اسلام اورسلسلۂ جہاد منقطع ہوگیا۔

☆ دینی وسیاسی مسائل وآراء کے اختلاف میں پوری شدت ابھرآئی،جس کی نمایاں مثال جنگِ جمل وصفین اور جنگ نہروان ہے۔

☆ دنیااورزخارفِ دنیامیں اضافہ اوراسی حساب سے فکرآخرت میں مزیدکمی پیداہوگئی۔

☆ حضرت علیؓ اپنے اجتہادات اور سیاسی تدابیر میں اس حدتک غیرمحفوظ نہ رہے جیسے ان کے

پیش رَو خلفاء رہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تاریخ اسلام، جمل و صفین جیسے واقعات سے خالی رہتی۔

## دورِ معاویہؓ میں:

نظامِ حکومت اور عام معاشرے میں دینی گرفت پچھلے ادوار کی نسبت کچھ ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور نبوت کے عظیم و روحانی اثرات بتدریج کم ہوتے نظر آتے ہیں وَ هَلُمَّ جَرًّا

حضرات امیر معاویہؓ کے عہد اقتدار ۶۰ ھ تک، سیاسی اعتبار سے صحابہ کرامؓ کی حکمرانی کا دور ہے یعنی جس میں حکمرانِ اعلیٰ (خلیفہ) نہ صرف کوئی نہ کوئی صحابی ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی اعتبار سے دیگر اصحاب رسول میں ممتاز اور خصوصی صفات کا حامل ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ جلیل القدر حضرات اسلامی معاشرے میں پیدا ہوتے ہوئے بگاڑ کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ دراں حالیکہ صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر اصلاح اور بگاڑ کو روکنے کا جذبۂ صادقہ اور کسی میں نہیں ہوسکتا لیکن اس کے باوجود بگاڑ کے طبعی اور قدرتی اسباب کی بنا پر خود خلفائے راشدین (عثمانؓ و علیؓ) کے دور میں اسلام کے نظام اجتماعی میں بگاڑ کو در آنے کا موقع مل گیا۔

یہ بات مسلّم ہے کہ صحابہ کرام سیرت و کردار، مزاج و اطوار اور انتظامی و سیاسی صلاحیتوں میں باہم متفاوت تھے، اس اعتبار سے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے سیرت و کردار کی جس پختگی اور سیاسی و انتظامی معاملات میں جس بیدار مغزی کا ثبوت دیا، عثمانؓ و معاویہؓ ہوں یا حضرت علیؓ ان میں ہمیں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ لیکن ایک چیز ہمیں تسلیم کرنی چاہیے کہ معروف کی اشاعت، منکر کا استیصال اور بگاڑ کو روکنے کا جذبۂ بے پایاں ان تمام

حضرات میں بالخصوص دیگر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بالعموم ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔اس لیے خاکسار کو یہ امر تسلیم کرنے میں سخت تأمل ہے کہ عثمانؓ ومعاویہؓ نے عمداً ایسا طرز عمل اختیار کیا ہو جس سے بگاڑ کو تقویت پہنچی ہو یا جس سے اسلام کے تقاضے مجروح اور عوام کی حق تلفی ہوئی ہو۔

بنابریں عمومی بگاڑ کے اسباب کا صحیح اور دیانت دارانہ تجزیہ یہ ہے کہ زمانۂ رسالت کے بُعد اور اس کے باطنی وروحانی فیوض وبرکات میں بتدریج کمی کی وجہ سے بعض ایسے خارجی اسباب پیدا ہوگئے تھے جن سے بگاڑ کے عوامل کو اسلامی معاشرے میں کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا۔ان میں سے چند اہم تر اسباب یہ تھے۔

اولاً خود اسلامی معاشرے کے مزاج میں آخرت کے مقابلے میں دنیا داری کا رجحان پیدا ہونا شروع ہوگیا۔

ثانیاً کثرتِ فتوحات کے باعث مال ودولت کی فراوانی ہوگئی، جو بجائے خود بہت سے فتنوں اور حشر سامانیوں کا پیش خیمہ بن گئی۔

ثالثاً فتوحات ہی کے نتیجے میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے نومسلم وعجمی رعایا کی اسلامی قلمرَو میں شامل ہوگئی،جس نے اگرچہ زبان سے کلمۂ لا اِلٰہ اِلا اللہ پڑھ لیا تھا لیکن ان کو اسلامی نہج پر اپنے افکار جاہلیت کی تطہیر اور سیرت وکردار کی تعمیر وتربیت کے زیادہ مواقع میسر نہ آئے تھے۔اس بناء پر مسلمان ہونے کے باوجود ان کے اندر اپنے علاقے، ماحول اور جاہلی تمدن کی خُو بُو موجود رہی اور ان کی سن رسیدہ ہڈیوں میں رچے بسے غیر اسلامی اثرات بالکلیہ ختم نہ ہوسکے تھے۔

**رابعاً** اسلام کی بڑھتی طاقت کا جواب دینے کی کسی کے اندر جب سکت نہ رہی تو یہود و نصاریٰ کے ایک گروہ نے ظاہری طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر سازش کا راستہ اختیار کرلیا اور نو مسلم عجمی رعایا میں سے کمزور عناصر کو اپنے ساتھ ملا کر اسلامی علاقوں میں داخلی انتشار برپا کرنے کی کوشش کی۔

**خامساً** نئے مسلمانوں کی اتنی عظیم تعداد کے مقابلے میں اسلامی حکومتوں کا وہ صحیح و خالص عنصر، جو شرفِ صحابیت سے بہرہ ور اور سیرت و کردار کی اعلیٰ خصوصیات کا حامل تھا، بہت کم رہ گیا تھا۔

یہ اور ان جیسے دیگر اسباب و عوامل، مذکورہ عظیم و جلیل القدر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے عزائم کے بروئے کار لانے میں مزاحم ہو گئے۔ اور وہ بگاڑ کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور حالات و ظروف کے لحاظ سے وہ اس پر قادر نہ تھے کہ بگاڑ کو بالکلیہ روک دیں۔ ان کا یہی کارنامہ ان کی عظمت کے لیے کافی ہے کہ انہوں نے بگاڑ کے اس قدرتی سیلاب کو روکنے اور اس کو کم کرنے کے لیے ممکنہ حد تک کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ **فجزاهم الله أحسن الجزاء و رضي الله عنهم و رضوا عنه**

موجودہ دور کے بہت سے وہ افاضل جنہوں نے قرن اول کے حالات و واقعات پر خامہ فرسائی کی ہے، افسوس ہے کہ انہوں نے اس دور پر بحث کرتے ہوئے مذکورہ بزرگ صحابیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور بہت حد تک سطحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

ان حضرات کی اولین بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے تغیر کے اسباب و عوامل کی نشاندہی میں بالغ نظری سے کام نہیں لیا ہے، تغیر کے جو حقیقی عوامل اور طبعی اسباب تھے، انہیں تو نظر انداز کر دیا اور بگاڑ کا ایک خانہ ساز سبب ملوکیت کو بنایا اور اسی کو تمام برائیوں کا منبع و مصدر باور کرایا۔

دوسری غلطی ان حضرات کی یہ ہے کہ ان کے نقطۂ نظر سے بگاڑ صرف سیاست (نظام حکومت) میں آیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بگاڑ ہر شعبۂ زندگی میں اپنی تدریجی رفتار سے آیا ہے جس کے اثرات سیاست پر بھی پڑے، نہ یہ کہ دفعتاً نظام حکومت میں بگاڑ اس طرح آیا جس طرح ریل کی پٹڑی کا کانٹا بدلنے سے گاڑی کا رخ فوراً تبدیل ہو جاتا ہے۔

تیسری غلطی ان حضرات کی یہ ہے کہ انہوں نے جرم وسزا کے تناسب کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ حضرت عثمانؓ ہوں یا معاویہؓ یا اور دیگر خلفاء وملوک' یہ سب آخر اسی مشتِ خاک سے بنے ہوئے انسان تھے جن کے خمیر میں خطاونسیان کا مادہ شامل ہے۔ اس لیے ان سے کوتاہیاں ممکن تھیں۔ اور ان سے کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوئی بھی ہیں لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس انداز کی کوتاہی سرزد ہوئی ہے، اس کو اسی تناسب سے سزا کا مستحق اور مجرم گردانا جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایک غلطی کی سزا سوئی کی چبھن ہو لیکن وہاں سوئی کی جگہ نشتر اس کے رگ وپے میں اتار دیے جائیں، تعزیر کے مستحق مجرم کو حوالۂ دار ورسن کر دیا جائے۔ معمولی کوتاہی کو خوفناک اور بھیانک انداز میں پیش کر کے اس کی واقعی قباحت کو ہزاروں گنا بڑھا کر پیش کیا جائے، اجتہادی نوعیت کی غلطی کو اسلام کی تباہی وہلاکت سے تعبیر کیا جائے اور ان کی تمام خوبیوں اور کارناموں کو نظر انداز کر کے خوردبین کے ذریعے سے ان کے صرف کمزور پہلوؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سامنے لایا جائے بلکہ ان کی فردِ جرم میں اپنی طرف سے بھی اضافے کر دیے جائیں۔

حضرات محترم! جب ''ملوکیت'' کو ہی فساد کا سب سے اہم سبب سمجھ لیا گیا تو اپنے اس نقطۂ نظر کے اثبات کے لیے ان حضرات نے یہ سارے ہی ظلم ہمارے بعض جلیل القدر بزرگوں

پر ڈھائے ہیں۔شاید کسی ایسے ہی موقع کے لیے کہا گیا تھا ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

# موجودہ حالات میں کیا جمہوریت ہمارے لیے موزوں اور مناسب ہے؟

مجھے احساس ہے کہ مقالہ طویل ہوتا جا رہا ہے اور یہ سمع خراشی شاید آپ میں سے بہت سوں کے تکدرِ خاطر کا باعث ہو لیکن ابھی ایک نکتے پر گفتگو باقی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پر بھی چند باتیں ہو ہی جائیں کہ ؎

امیرؔ جمع ہیں احباب، حالِ دل کہہ لے<br>
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

توحضراتِ محترم! میرے موضوع کا چوتھا نکتہ یہ ہے کہ ہمارے دور کے اکثر مفکرین نے مغربی جمہوریت کو اسلامی خلافت کا متبادل بلکہ نعم البدل سمجھ کر قبول اور اسے ''اسلامی جمہوریت'' کا عنوان دے کر مشرّف بہ اسلام کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں خلفائے راشدین کے انتخاب کو بھی جمہوری ثابت کرنے کے لیے حقائق و واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ راقم خاکسار کو اس سے بھی اختلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ساحرانِ مغرب نے ''جمہوریت'' کا صور اس زور سے پھونکا ہے کہ سارا عالم اس قتالہ کا والہ و شیدا اور اس کی زلف و ادا کا اسیر ہو گیا ہے ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے<br>
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

کے مصداق بڑے بڑے اہل علم وفکر نے بھی اپنی جبین نیاز محرابِ جمہوریت میں جھکا ڈالی اور اس کی بارگاہِ شہرت میں سجدہ ہائے نیازی بجالانے میں ہی عافیت سمجھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نظام حکومت (خلافت) اور جمہوریت میں بُعد عظیم ہے۔ اس لیے اسلام کے ساتھ جمہوریت کا پیوند بھی اسی طرح غلط ہے جس طرح سوشلزم کے ساتھ اسلام کی پیوند کاری کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام اور مغربی جمہوریت میں جو فرق ہے اس کی تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں، ممکن ہے اس مذاکرے میں شریک کچھ اہلِ علم اس موضوع پر اظہار خیال فرمائیں، اس لیے میں فی الحال اس سے صرف نظر کرتے ہوئے جمہوریت کے کچھ اور پہلوؤں کی نقاب کشائی کرنا چاہتا ہوں۔

میرے خیال میں شاید جمہوریت ہی کی عشوہ طرازیوں سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے دور کے بعض مفکرین نے اسلامی خلفاء وملوک پر بے رحمانہ تنقید کی ہے جس کی کچھ تفصیلات گزشتہ مباحث میں گزر چکی ہیں۔

اسی طرح میرے خیال میں جمہوریت نے اسلامی وحدت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ترکی کی خلافت عثمانیہ جیسی کچھ بھی تھی، عالم اسلام کی مرکزیت و وحدت کی علامت تھی اور خلافت کا یہ ادارہ اپنی تمام تر کمزوری وزبوں حالی کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کی قوت وطاقت کا منبع تھا۔ مصطفی کمال پاشا کے الغاءِ خلافت کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ ترکی خلافت اسلامیہ کے اعزاز ومنصب سے محروم ہوگیا۔ اور اسلام کو وہاں سے دیس نکالا مل گیا بلکہ پورا عالم اسلام مختلف

ٹکڑیوں میں بٹ گیا اور مسلمانوں کی قوت وطاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔

اس ادارۂ خلافت کے خاتمے کے بعد ترکی سمیت مختلف اسلامی ملکوں میں جمہوری نظام نافذ ہوا۔ جس سے اولاً اسلامی ملکوں میں سیکولر ذہن پیدا ہوا۔ پھر رواداری اور عوامی حقوق کے نام پر ہر قسم کے نظریے کے پرچار اور اشاعت کی کھلے بندوں اجازت دی گئی۔ جس سے تصلُّبِ دینی کی بجائے دین میں مداہنت کا روگ عام ہوا۔ اسلامی احکام سے غفلت، شعائر اسلام سے بیگانگی اور اسلامی تہذیب وتمدن سے نفرت، مسلمانوں کا شعار قرار پایا اور مغربی تہذیب کی برتری کا نقش ذہنوں میں قائم ہوا۔ اور اب معاملہ ذہنی ارتداد اور اسلام سے عملی بغاوت تک پہنچ گیا ہے۔ کسی بھی اسلامی ملک کو دیکھ لیجیے کہ بجز سعودی عرب کہیں بھی اسلامی قانون کی عملداری نہیں ہے بلکہ ہر جگہ مغربی جمہوریت اور مغربی نظام قائم ہے۔ عدالتیں مغربی قوانین کے تحت فیصلے کرتی ہیں۔ مغرب کا سودی نظام اسلامی ملکوں کی معیشت کی بنیاد ہے۔ حتی کہ مخلوط تعلیم تک کی لعنت اسلامی ملکوں میں موجود ہے۔ حکومتوں کی تمام پالیسیوں اور اقدامات میں مغربی ذہن کی کارفرمائی ہے۔ الغرض زبان سے لے کر لباس تک معاشرت سے لے کر سیاست تک اور ذہن وفکر سے لے کر طرز بود و باش تک ہماری نسل نو کی اکثریت مغربی سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ اعتقادات کی بنیاد کھوکھلی ہے اور ایمان کی عمارت متزلزل' اور عمل کی بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔

یہ نتیجہ ہے مغربی نظام وتہذیب کی اس برتری کا جو مغربی استعمار کے راستے سے اسلامی ملکوں میں داخل ہوا اور جمہوریت کے ذریعے سے جسے استحکام نصیب ہوا۔ کیوں کہ ہمارے

اسلامی ملکوں کی لیڈر شپ ذہناً اس سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جو کارگہِ مغرب کے تیار کردہ ہیں۔ اس لیے انہوں نے چاہے اپنے مخصوص مفادات کے پیش نظر جمہوری نظام کو صحیح معنوں میں قائم نہ ہونے دیا ہو لیکن جمہوری نظام میں تخریبی عوامل کو کھل کر کھیلنے کا جو موقع ملتا ہے، وہ انہوں نے ضرور مہیا کیا، جمہوریت کی بعض مسلمہ قدروں کو اپنانے سے چاہے گریز کیا ہو لیکن مغرب کے جمہوری نظام میں نظریاتی انتشار اور فکری و اخلاقی انارکی پھیلانے کی جو گنجائش ہے، اس کے اسباب زیادہ سے زیادہ مہیا کیے۔ مغرب کے جمہوری نظام میں جو کچھ خوبیاں ہیں۔ ان سے اگرچہ ہمارے حکمراں گریزاں ہی رہے لیکن اس کے نام پر معاشی لوٹ کھسوٹ اور معاشی استحصال کی حوصلہ افزائی ہی کی ہے۔ نتیجتاً ہر اسلامی ملک قولاً نہ سہی عملاً اسلامی تہذیب کو خیر باد کہہ چکا ہے اور مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر کو اپنانے کا شوق فراواں جنوں کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ نسل نو نظریاتی ژولیدگی اور فکری انارکی میں مبتلا ہے۔ اور ایک طبقہ سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے ردعمل میں سوشلسٹ نظریات کا گرویدہ نظر آتا ہے اور بعض اسلامی ریاستیں تو سوشلسٹ نظریات پر ہی قائم ہیں تاہم اباحیت و زندقہ اور اسلامی تہذیب و شعائر سے بیگانگی و بغاوت کا رجحان ان سوشلسٹ ریاستوں میں بھی روز افزوں ہے۔

ہر اسلامی ملک ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہے اور گومگو کیفیت سے دوچار ہے ۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

عوام میں سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ اسلامی تربیت و کردار سے بھی وہ محروم ہیں اور

حکمران طبقہ اپنے مفادات کے گنبد میں محصور عوام کی فکری واخلاقی تربیت کے فریضے سے یکسر غافل ہے۔ سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کی تگ ودو کا محور بھی مخصوص مفادات کی حفاظت اور جماعتی وذاتی مقاصد کے حصول تک محدود ہے۔

ان حالات کے باوجود ہم نے ''جمہوریت'' کو اس معنی میں اپنایا ہوا ہے کہ ہر شخص اور جماعت کو اپنے نظریات کے پرچار کی اجازت ہے کہ وہ نسل نو کو جس طرح چاہے گمراہ کرے، صحافت کو اور دیگر ذرائع ابلاغ کو مادر پدر آزادی حاصل ہے کہ وہ گھر گھر عریانی وفحاشی کا سیلاب پہنچادیں۔ سرمایہ داروں کو یہ عام اجازت ہے کہ وہ اپنے سرمائے کے بل پر جس طرح چاہیں عوام کا خون چوسیں، مزدوروں کا استحصال کریں اور گرانی میں اضافہ اور بے ہودہ مصنوعات کے ذریعے سے عوام کا اخلاق تباہ کریں اور پھر اس سرمائے سے شاہد وشراب کی محفلیں جمائیں، ناچ گھروں اور کلبوں کی رونقیں بڑھائیں اور جنون وسرمستی کا ناٹک عام رچائیں۔ ادب ودانش کے گہواروں اور تعلیم وتربیت کے اداروں میں اسلام دشمنوں کو یہ اذنِ عام حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں کی نوخیز نسلوں اور ناپختہ ذہنوں میں غیر ملکی نظریات کی آبیاری کریں اور انہیں اسلام سے متنفر اور بیزار کریں۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ''جمہوریت'' کا یہی مفہوم ہم نے سمجھا ہوا ہے اور کیا جموریت کی یہ حشر سامانیاں ہم میں سے ہر شخص کے تجربہ ومشاہدہ کا حصہ نہیں ہے؟ پھر بحالات موجودہ ''جمہوریت'' ہمارے دکھوں کا علاج، ہمارے درد کا درماں اور ہمارے مسائل کا حل ہے؟ یا ہمارے لیے زہرِ ہلاہل، موت کا پیالہ اور ہماری تہذیب وثقافت اور ہمارے دین ومذہب کے

لیے خودکشی کا سامان ہے۔آہ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب

اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

جس جمہوریت نے ہمیں اپنی تہذیب وثقافت سے محروم کیا، ہمیں احکام اسلام اور شعائر دین سے بیگانہ بنایا اور ہماری اسلامی وحدت ومرکزیت کو پارہ پارہ کیا۔آہ کتنی رلا دینے والی یہ حقیقت ہے کہ وہ جمہوریت آج ہمارے بہت سے اہل علم کے نزدیک بالعموم اور سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کے نزدیک بالخصوص ہمارے دکھوں کا واحد علاج قرار پائی ہے۔آہ! نگاہ کی نامسلمانی سے فریاد اقبالؒ نے بھی یہی ماتم کیا تھا ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

میں مانتا ہوں کہ اسلام کا نظامِ خلافت مستبدّ انہ وآمرانہ نہیں بلکہ جمہوری مزاج کا حامل ہے لیکن اس جمہوری مزاج کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانِ اعلیٰ بھی تنقید اور محاسبے سے بالا نہیں اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی پر اسے بھی ٹوکا اور روکا جا سکتا ہے۔ وہ قانون سے بالاتر نہیں، اگر وہ قانون شکنی کا ارتکاب کرے گا تو ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کو عدالت کے کٹہرے میں لے جائے۔ وہ اہل الرائے اصحاب کے مشورے اور رائے کا پابند ہے اور عام حالات میں ان سے تجاوز کرنا اس کے لیے مناسب نہیں لیکن اس جمہوریت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے جو آج بیشتر اسلامی ملکوں میں رائج ہے۔اسلام میں منکرات کی اشاعت کی قطعاً

اجازت نہیں ہے جب کہ مغربی جمہوریت کی ساری بنیاد منکرات کی اشاعت عام اور اجازت عام پر قائم ہے جیسا کہ گزشتہ سطور میں وضاحت کی گئی ہے۔

اس لیے مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں اور اسلامی تہذیب و نظام اسلامی ملکوں میں جاری وساری ہو تو اس کے بغیر چارہ نہیں کہ ہم مغربی جمہوریت سے ناطہ توڑ کر اپنے حالات کے مطابق ایسا طرز انتخاب اختیار کریں جو مغربی طرز انتخاب سے مختلف ہو جس میں بندوں کو گنا جاتا، تولا نہیں جاتا۔ ہمارے لیے موزوں طریقۂ انتخاب وہی ہے جس میں بندوں کو تولا جائے، گنا نہ جائے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکر انسانے نمی آید

ایسے مناسب اور معقول طریقۂ انتخاب کی تفصیلات اہل علم وفکر طے کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ '**والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا**' 'جو ہماری راہ میں جہد وسعی کرتے ہیں ہم ان کے لیے اپنی راہیں کھول دیتے ہیں' بلکہ اگر ہو سکے تو جس ادارۂ خلافت کو شوقِ جمہوریت میں ختم کر دیا گیا اس کا احیاء عمل میں لایا جائے کہ وہ ادارۂ خلافت ہی ہماری قوت وطاقت کا منبع تھا اور ہماری تہذیب وثقافت اور دین مذہب کا امین و پاسبان بھی ؎

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

ورنہ جس طرف ہم جا رہے ہیں اور جمہوریت کو جس انداز سے ہم نے اپنایا ہے اور الگ

الگ ریاستوں اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو جس طرح ہم نے بہ رضا و رغبت اور ضمیر کی ادنیٰ سی خلش کے بغیر قبول کرلیا ہے، اس کے پیش نظر یہی کہا جاسکتا ہے ۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
این راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

# موجودہ ملکی حالات سے متعلق چند باتیں

حضرات محترم! اگر اجازت ہوتو چند باتیں موجودہ ملکی حالات کے متعلق بھی عرض کروں۔

ہمارے ملک کے سیاسی حالات آج کل پھر سخت دگرگوں ہیں۔ اگر چہ واقعہ یہ ہے کہ سیاسی طور پر ہمارے ملک کو اطمینان واستحکام کبھی بھی حاصل نہیں ہوا۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ جب بھی انتقالِ اقتدار کا کوئی مرحلہ آیا ہے تو عوام کے ایک طبقے نے سکھ کا سانس لیا ہے اور نئے صاحب اقتدار سے توقعات کے پُل باندھے اور امیدوں کے شیش محل قائم کیے۔ لیکن مرور ایام کے ساتھ توقعات کے پُل بھی ڈھے چلے گئے۔ اور امیدوں کے شیش محل چکنا چور ہو گئے۔ کیوں کہ ہر آنے والے حکمران نے باتیں بڑی اچھی اچھی کیں، حسین وعدے کیے، امیدوں کے سبز باغ دکھائے، مسائل حل کرنے کا عزم بالجزم ظاہر کیا اور علی الخصوص اسلامی نظام کے قیام کو اپنا مقصد ومحور باور کرایا۔ لیکن ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ سب وعدے سراب ثابت ہوتے رہے، عوام کے مسائل حل ہونے کی بجائے مزید الجھ جاتے رہے اور حالات سنگین سے سنگین تر۔ اعلانات اسلامی نظام کے قیام کے ہوتے رہے لیکن اقدامات اور پالیسیاں سب اسلام کے خلاف۔ جن سے ملک اور افراد وقوم بڑی تیزی سے اسلامی اقدار وتہذیب سے بیگانہ اور دور ہوتے چلے گئے۔

صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے متعلق تو لوگوں کا پختہ خیال تھا کہ یہ شخص ضرور

اپنے پیشرو حکمرانوں سے مختلف اور قول وعمل کے تضاد سے پاک ہوگا اور کچھ سنہری کارنامے سر انجام دے گا لیکن افسوس ہے کہ صدر محترم جناب جنرل ضیاء الحق کے ذاتی کردار، شرافت وحلم اور تواضع وفروتنی کا اعتراف کرتے ہوئے جہاں تک ملکی مسائل، عوامی مشکلات اور اسلامی نظام کے قیام کا تعلق ہے، یہ دور بھی سخت ناکام رہا ہے اور ایک مبصر کو بجا طور پر کہنا پڑتا ہے ۔

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

چنانچہ عوام اب پھر سخت مضطرب، پریشان اور سرکاری اداروں اور اہلکاروں سے سخت نالاں ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ گرانی کا منہ زور گھوڑا بالکل بے لگام ہوگیا ہے، جرائم میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے، رشوت کے بغیر کسی کام کا تصور بھی ممکن نہیں، بے حیائی کا ایک طوفان ہے جو امڈا چلا آرہا ہے۔ اور بے دینی کا ایک سیلاب ہے جو تمام بندوں کو توڑ کر ہمارے گھروں کے اندر گھس آیا ہے۔

عوام کے اضطراب اور پریشانی کی وجہ انتخابات کا عدمِ انعقاد نہیں، عوام اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ انتخابات مسائل کا حل نہیں (جیسا کہ اہلِ سیاست یہ تأثر دیتے ہیں) بلکہ انتخابات کے ساتھ بڑی تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ ہمارے ملک میں جب بھی عام انتخابات ہوئے ہیں، ملک ایک نئی افتاد ہی سے دوچار ہوا ہے۔ محب وطن حلقوں میں اب بھی بجا طور پر یہ اندیشہ پایا جاتا ہے کہ اگر پھر انتخابات کا ڈول ڈالا گیا تو نہ معلوم اس کا کیا نتیجہ برآمد ہو؟

لیکن پھر یہ سوال ایک خوف ناک شکل میں سامنے آکھڑا ہوتا ہے کہ جب موجودہ حکومت بھی ناکام ہے اور انتخابات بھی مسائل کا حل نہیں تو پھر کیا کیا جائے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں اہل

دانش کی عقلیں حیران ہیں، دماغ ماؤف ہیں اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کم از کم راقم کی نظر میں موجودہ صورت حال ظُلُمَات بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کی آئینہ دار ہے اور یہی صورت ہے جس کی خبر ختمی مرتبت نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک حدیث میں دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''یکون فی آخر الزمان رجال یختلون الدنیا بالدین یلبسون للناس جلود الضأن من اللبن ألسنتهم أحلیٰ من العسل و قلوبهم قلوب الذئاب یقول اللہ تعالیٰ أبِیْ تفترون أم عَلیَّ تجترئون فَبِیْ حلفتُ لأبعثن علی أولئک منهم فتنة تدع الحلیم منهم حیران''

(ترمذی بحوالہ جمع الفوائد ج/۱۔ص/۳۹)

کہ ''جب ایسے لوگ ہوجائیں کہ نام دین کا لیں اور کام دنیاداری کے کریں، زبان کے بڑے میٹھے ہوں لیکن دل بھیڑیے کی طرح سخت ہوں، وہ اللہ کو دھوکہ دیتے ہوں اور اس کے حق میں جسارتوں کا ارتکاب کرتے ہوں تو ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ ایسے فتنے میں لوگوں کو مبتلا کر دیتا ہے کہ بڑے بڑے سمجھ دار لوگ بھی حیران رہ جاتے ہیں۔''

اس حدیث کی صداقت اس سے واضح ہے کہ مستقبل کے متوقع حکمران یعنی سیاستدان بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں، حالات کی اصلاح کے لیے کسی کے پاس کوئی معقول حل نہیں ہے۔ ایم آر ڈی میں اکثریت ان سیاست دانوں کی ہے جن کے درمیان بناءِ اتحاد ضیاء دشمنی ہے۔ اس میں اگرچہ بعض قابلِ احترام شخصیتیں بھی شامل ہیں لیکن وہ محض جمہوریت کے ہجر وفراق کے صدمے سے نڈھال ہوکر اس میں شامل ہوگئی ہیں جس سے خود ان کی شخصیت مجروح ہوئی ہے۔ یہ ایم آر ڈی والے تحریک چلا رہے ہیں، لیکن ظاہر بات ہے کہ تحریک ایک تو

روز روز نہیں چلتی، اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم قومی اتحاد کی تحریک کی طرح کوئی تحریک بر پا کر سکتے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔ یہ عوام کے دیکھے بھالے لوگ ہیں۔ دوسرے تحریک کے لیے ان کے پاس کوئی واضح مقاصد نہیں، جس سے تحریک میں جان پڑ سکے۔ اس لیے تحریک سے ملک میں انتشار مزید تو ہوسکتا ہے، اصلاحِ احوال کی کوئی امید نہیں۔ جس طرح سندھ میں تخریبی عناصر اور ملک دشمن گروہ نے اس تحریک کی آڑ میں کیا ہے۔

مسلم لیگ (پگارہ گروپ) نے اذانوں کا سلسلہ شروع کیا ہے جو محض دین کے ساتھ ایک استہزا و مذاق ہے۔ اول تو انتخابات کا عدم انعقاد کوئی مصیبت نہیں جس کے لیے اذانیں دی جائیں اور انتخابات کی دیوی رام ہو جائے اور اگر موجودہ حکمرانوں کا کردار و عمل مصیبت سمجھا جائے، تب بھی مصیبت کے ازالے اور دفعیے کے لیے اگرچہ اذانیں دینے کا رواج عوام میں پایا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں ہے۔ ملک کی ایک انتہائی ذمہ دار پارٹی کی طرف سے ایسی بات کا اقدام، جس کا قرآن وحدیث میں کوئی ثبوت نہ ہو، بالکل نامناسب بات اور اس کے وقار کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں اس سے کسی خاص فائدے کی بھی امید نہیں، نہ اس سے اصلاح احوال ہی کی صورت پیدا ہونے کا امکان ہے۔

محض اذانیں دینے کی بجائے اگر یہ کیا جائے کہ لوگ مسجدوں میں جا کر باجماعت نماز پڑھیں، اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوں، اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور اللہ تعالیٰ سے اصلاح احوال کی دعائیں کریں تو ہوسکتا ہے بلکہ یقین غالب ہے کہ قوم کی اجتماعی تبدیلی (اللہ کی طرف رجوع اور اپنے گناہوں کی معافی) اللہ کی رحمت کے نزول کا باعث بن جائے اور اللہ تعالیٰ

اصلاح احوال کی صورت پیدا فرمادے ورنہ بظاہر تو اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ انتخابات اگر ہوتے ہیں تو اصلاح کی بجائے حالات بدتر ہونے کا ہی امکان زیادہ غالب ہے اور موجودہ صورت بھی سخت اضطراب انگیز اور ۔

قومے بہ میرد از بے یقینی

کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے یہ وہی مقام ہے جہاں کوئی علاج نہیں سوجھتا، کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔ اہل سیاست ہوا میں تیر چلا رہے ہیں جس کا کوئی ہدف نہیں۔ پگارہ گروپ بانگیں دے رہا ہے جس سے مقصود اللہ کی طرف رجوع نہیں، محض سیاست کے ویرانے میں اپنے وجود کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔ اور اہل اقتدار کے لیے' اقتدار گلے کی پھانس بن گیا ہے، نہ اُگل سکتے ہیں نہ نِگل سکتے ہیں۔ یہ ہمہ مقتدر طبقہ اپنی جگہ پریشان ہے۔ انتخابات سے بھی وہ الرجک ہے اور برسر اقتدار رہنا بھی ان کے لیے مشکل تر۔ کیوں کہ اس کے اقتدار کا پیریڈ منتخب حکمرانوں سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ کام کچھ نہیں کر رہا ہے۔ محض خوش کن اعلانات اور دلفریب وعدوں سے وقت گزاری کر رہا ہے۔ آخر یہ بے مقصد حکمرانی، جس سے ملک کے مسائل سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں' کب تک چلے گی اور بلا جواز اس کو وہ کب تک طول دیں گے؟

بنابریں اس کا یہی واحد حل ہے کہ قوم کے اندر انابت الی اللہ کا جذبہ پیدا ہو، ہم نے من حیث القوم جو بدعملی اور معصیت کاری کا راستہ اختیار کیا ہوا ہے، اس سے قوم توبہ کرے اور من حیث القوم نیکی اور اطاعت الٰہی کا راستہ اختیار کرے۔ اپنے پچھلے گناہوں پر نادم و پشیمان ہو۔ اور آئندہ سے ترک معصیت کا پختہ عزم کر لے۔ رو رو کر اور گڑگڑا کر اپنے روٹھے ہوئے رب کو

منا لے اور یہی وہ حل ہے جو آج سے ۱۴ سو سال قبل ہمارے آقا سردار حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی حدیث قدسی میں ہے:" قال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **إن اللہ تعالیٰ یقول انا اللہ لا إلٰہ إلا أنا مالک الملوک و ملک الملوک قلوب الملوک فی یدی و إن العباد إذا أطاعونی حولت قلوب ملوکهم علیهم بالرحمة والرأفة وان العباد إذا عصونی حولت قلوبهم بالسخطة والنقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشغلوا أنفسکم بالدعاء علی الملوک ولکن اشغلوا أنفسکم بالذکر والتضرع کی الفیکم**" (رواہ ابونعیم فی الحلیۃ، مشکوۃ ج/۲، ص/۳۲۳)

حدیث کا ترجمہ ہے۔

"حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا مالک، تمام بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں۔ جب بندے میری اطاعت کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کے اندر ان کے حق میں نرمی، شفقت اور محبت کے جذبات پیدا کر دیتا ہوں۔ لیکن جب بندے میری نافرمانی کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں کے دلوں کو عوام کے حق میں سخت اور منتقمانہ کر دیتا ہوں۔ پس وہ ظلم و جور کا بازار گرم کر کے عوام کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔"

بنابریں ایسے موقعوں پر بادشاہوں کو بددعائیں دینے کے بجائے اپنے آپ کی اصلاح کرو، اپنے کو میری (یعنی اللہ کی) یاد میں لگاؤ اور میر بارگاہ میں گڑگڑاؤ تاکہ میں تمہاری مشکلات

میں تمہاری یاوری اور کفایت کروں‘‘۔

ہماری زبان میں بھی ایک محاورہ ہے ’’جیسی روح ویسے فرشتے‘‘ اسی طرح کی ایک عربی ضرب المثل ہے ’أعمالکم عُمّالُکمْ‘ جس کو ایک فارسی مصرعے میں اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

افسوس ہے کہ قدرت کے اس اٹل قانون کو ہم نے بالکل فراموش کر دیا ہے کہ ہم جو کچھ بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو

گندم از گندم بروید، جوز جو

# بحیثیت مجموعی قوم اپنا رخ بدلے

۳۶ سال سے ہمارا یہی معمول چلا آ رہا ہے کہ ہم حکمرانوں کو تو کوستے ہیں۔ بیوروکریسی کو تو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں، سیاستدانوں کو تو مطعون کرتے ہیں، انتظامیہ اور پولیس کا تو رونا روتے ہیں۔ اسی طرح دیگر طبقات کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی شخص بھی اپنی اور اپنے دائرۂ اثر کے افراد کی اصلاح کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جب کوئی حکمران یا برسرِ اقتدار سیاسی جماعت ناکام ہو جاتی ہے تو ہماری سوچ صرف اسی بات تک محدود رہتی ہے کہ اب اس کی جگہ کسی اور شخص یا پارٹی کو برسرِ اقتدار آنا چاہیے اور اسی نقطۂ نظر سے کوششیں ہوتی ہیں لیکن کوئی شخص اپنی سیرت و کردار کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ بحیثیت مجموعی پوری قوم روز افزوں اخلاقی زوال کا شکار ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں سوچتا کہ جب پوری قوم کا مزاج ہی بگڑ جائے، اخلاقی لحاظ سے وہ دیوالیہ ہو جائے اور امانت و دیانت اور راست بازی جیسے اوصافِ عالیہ اس سے ناپید ہو جائیں تو ایسی قوم سے صالح قیادت کیوں کر پیدا ہو گی؟ صحیح انتظامیہ کہاں سے آئے گی؟ افسران اور وُزَراء کی زندگیاں خدا خوفی کی مظہر کیوں کر ہوں گی؟ آخر حکمران افراد بھی تو اسی قوم کے فرد ہوں گے جو اخلاق باختہ ہو چکی ہے۔ ان حکمرانوں میں پھر سیرت و کردار کی خوبی کیوں کر ہو گی؟ انتظامیہ کے افراد بھی تو اسی قوم کا حصہ ہوں گے جو امانت و دیانت سے عاری ہو چکی ہے۔ پھر امانت دار و دیانت دار انتظامیہ کہاں سے آئے گی؟ افسران و وزراء بھی تو اسی قوم کے گوشت پوست کا حصہ ہیں جو عملاً دین و مذہب سے اپنا رشتہ توڑ چکی ہے اور فکری

آوارگی اور نظریاتی انتشار میں مبتلا ہے تو ایسے افسران ووزراء سے سیرت و کردار کی رفعت و پاکیزگی اور ایمان وعقیدے کی پختگی کی امید کس بنیاد پر کی جاسکتی ہے؟

پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ صالح قیادت میسر آئے، ہمیں نیک اور راست باز حکمران نصیب ہوں، انتظامیہ صحیح ہو، پولیس اور دیگر اہل کارانِ حکومت باکردار اور دیانت دار ہوں، ہمارے افسرانِ اعلیٰ، وزراء اور گورنران وغیرہ صحیح معنوں میں قوم کے خادم ہوں تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ پوری قوم بحیثیت مجموعی اپنا رخ بدلے' اپنا کردار صحیح کرے۔ امانت و دیانت کو اپنائے، مذہبِ اسلام کے اصول وقوانین اور اس کے اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرے اور خدا اور رسول کی بغاوت کا وہ راستہ چھوڑ دے جس پر وہ گامزن ہے تو پھر حدیث مذکور کے مطابق امید ہے کہ اللہ تعالی ہمارے حال پر رحم فرمائے گا۔ ان شاء اللہ ہمارے مسائل حل ہوں گے اور ہمیں صحیح انتظامیہ اور صحیح قیادت نصیب ہوگی۔

لیکن اگر ہم نے سیرت وکردار کی اصلاح کا یہ راستہ اختیار نہ کیا اور اللہ و رسول کی اطاعت کا سچے دل سے عہد نہ کیا تو یاد رکھیے لاکھ انتخابات ہوجائیں' نئے حکمران آجائیں' احتساب ومواخذہ کے کیسے ہی ادارے قائم کردیے جائیں اور دساتیر وقوانین کے انبار لگا دیے جائیں، ہمارے مسائل حل ہونے کی بجائے الجھتے ہی چلے جائیں گے، امن وسکون کی جگہ فساد وانتشار ہی میں اضافہ ہوگا، عدل وانصاف کی بجائے ظلم وجور ہی کی گرم بازاری ہوگی اور امانت و دیانت کی بجائے لوٹ کھسوٹ ہی کا سکہ رواں ہوگا۔

کاش ہم اس نکتے کو سمجھ سکیں اور اس کے مطابق عمل کی توفیق سے بہرہ ور ہوسکیں۔

من آنچہ شرطِ بلاغ است باتو گویم
توخواہ از سخنم پند گیر وخواہ ملال

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

۲۸/ستمبر ۱۹۸۳ء
یہ مقالہ ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ تیسرے مذاکرۂ ملی بعنوان
**''اسلامی ریاست کا تصور''**
بتاریخ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ بمقام کراچی پڑھا گیا۔